یادوں کے جھروکے

مشرقی پاکستان

انور رضا



یادوں کے جھروکے

(مشرقی پاکستان)

انور رضا

مصنّفہ : انور رضا

ناشر : نصر الاقبا

۲۷۶ سیکٹر ایف ۶/۳ ۔ اسلام آباد

مطبع : ایس۔ ٹی۔ پرنٹرز راولپنڈی۔
گوالمنڈی ۔ فون نمبر ۶۶۸۱۸

قیمت : پندرہ روپے

سرورق : عرفان

پیش لفظ

ہر روز اخباروں میں پڑھتی ہوں کہ وزیرِ اعظم فلاں جگہ دورے پر جا رہے ہیں بمقصد کچھ اور نہیں، سوائے عوامی رابطہ قائم کرنے کے ..... سوچتی ہوں کہ کیا یہ بھی آدابِ خسرواں ہوتے ہیں ... !! یہ جو خلفائے راشدین کی کہانیاں اور خلیفہ ہارون رشید کے قصے دہرائے جا رہے ہیں ۔ تو ..... تو ..... کیا گردشِ دوراں ماضی کی جانب نہیں لوٹ سکتی ہے کہ یہ نغمۂ محبت و شفقت ۱۹۷۱ء کا نغمہ بن سکے ... ! مگر ..... مگر ... اس وقت تو رُوم جلتا رہا اور نیرو اپنی بانسری بجاتا رہا ..... حاکمِ وقت کو اپنے طرب و نشاط سے اتنی فرصت نہ ملی کہ مشرقی بازو میں پھیلتی ہوئی آگ کو ایک نظر دیکھنے چلے جاتے ۔ نصف وطنِ عزیز کی راکھ سے ایک اور ملک نے جنم لیا ہے ... در و دیوار گریاں رہے اور وہ ..... ہنستا رہا ... اپنے لہو و لعب میں غلطاں رہا۔

اور پھر ... وسعتِ قلبی کا دور آیا ۔ مطرب نے محبت و شفقت کا اجنبی نغمہ چھیڑ دیا ... بنگلہ دیش کو ان کے "بونگو بوندو" بغیر کسی سودے بازی کے واپس کر دیتے گئے ۔ دنیا حیراں، یہ تماشائے لطف و کرم دیکھتی رہی کہ اس بازی کا واحد ترپ کا پتا اس آسانی سے کیوں پھینک دیا گیا ۔ اسلامی کانفرنس نے داتا کی نگری کو شاہانِ جاہ و جلال کا مسکن بنا دیا ۔ تاریخ محوِ حیرت نگراں ... کہ اخوتِ اسلامی نے ایک اور رنگ دکھایا۔ بنگلہ دیش تسلیم کر لیا گیا ... اور پھر ہمارے مغربی بازو کے علاقے ہمیں مل گئے ۔ ہمارے نوّے ہزار جنگی قیدی واپس آ گئے ... قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو گردباد کی طرح بنگلہ دیش جا پہنچے اور نیرنگیٔ سیاستِ دوراں نے عجب تماشا دیکھا کہ .... وہ ڈھاکہ جو کبھی ہمارا تھا مگر ہمارا وجود اس پر بوجھ بن گیا تھا، وہی ڈھاکہ اب ہمارا نہ تھا، مگر ہمارے قائد کو وہاں کے عوام نے سر آنکھوں پر بٹھایا ۔ تمام زخم، مرہمِ محبت نے مندمل کر دیئے، ہمارے سامنے اخوت و دوستی کے نئے باب وا ہوئے ۔ وہ بنگال جو ہمارا بھائی تھا، دوست بنکر پھر گلے سے لگ گیا ... کہ اخوت و محبت کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں ۔ کاش! اس ترانۂ اخوت و اُلفت کی ۱۹۷۱ء میں نغمہ سرائی ہو سکتی تو شاید ہماری یکجہتی یوں نوحہ خواں نہ ہوتی —— میں نہ تو اہلِ زباں ہوں نہ اہلِ قلم ... اس احساس کے باوجود کہ زبان و بیان میں بے شمار اغلاط موجود ہیں، مشرقی پاکستان کے متعلق اپنی ذاتی ڈائری اور مشاہدات پر مبنی یہ تحریر پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں ؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

انور رضا یکم اگست ۱۹۷۶ء

دیباچہ

سنہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا المیہ یہ تھا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں یہ دہرا المیہ بن گیا ہے۔

اس کی دوسری سطح یہ ہے کہ پانچ سال گزرنے کے بعد بھی قلم گونگے ہیں۔ جس بدنما حادثے کی پیشانی پر سوالات ایسے چپکے ہوں جیسے کسی بدصورت چہرے پر چیچک کے داغ، اس کے متعلق مصلحت آمیز خاموشی ایک مجرمانہ فعل ہے۔ قوم کی بے حسّی بری ہے مگر قلم کی بے حرمتی بدتر ہے۔ جس قوم کے قلم حقیقت نگاری سے اس حد تک دستبردار ہو جائیں کہ وہ مرثیوں کو یکسر نظر انداز کر کے صرف قصیدوں کے خوگر ہو جائیں۔ ان کی سیاہی خشک ہوتے ہوتے صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ قوم کی قبر کا کتبہ لکھ سکیں — ابن الوقت قلم، وقت کے قرطاس پر کبھی پکے نقوش نہیں چھوڑ سکتے۔

سقوطِ ڈھاکہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل کی انتہا تھا۔ اس کی پیچیدگی میں نیتوں کا کھوٹ حماقتوں کی تکرار، سازشوں کے جال، اقتدار کی بھوک اور نظریے کا الحاد سبھی کچھ شامل ہیں کسی ایک فرد کے لئے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر دردمند دل جو ڈوبنا جانتا ہے۔ ہر چشم بینا جو دیکھنا جانتی ہے اور ہر فہم و ادراک جو تجزیہ کر سکتا ہے۔ اپنے مشاہدات کو قلمبند کر دے۔ تاکہ اس پیچیدہ عمل کے کسی نہ کسی پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ سکے اور ہم جو اپنی آئندہ نسلوں کے سامنے فوجی شکست اور قومی ریخت کے مجرم ہیں، اتنا مواد

چھوڑ سکیں کہ وہ اس کے مختلف تراشوں کو جوڑ کر ایک مربوط داستان مرتب کر سکیں۔

اس لحاظ سے "یادوں کے جھروکے" ایک قابل قدر کوشش ہے کسی سنسنی خیز انکشاف کا دعویٰ کئے بغیر یہ ایک عینی شاہد کا ایسا بیان ہے جو بظاہر غیر اہم تفصیلات کے بین السطور بہت اہم اشارے مہیا کرتا ہے۔ اس کی ہیئت ڈائری کی نہیں مگر تاثر ڈائری کا ہے جس کی بنیادی خصوصیت اپنی ذات کے حوالے سے کوائف کا انتخاب کرنا ہے۔ ذاتی ہونے کی وجہ سے اس کی بہت سی تفصیلات آج کے قاری کے لئے غیر اہم ہو سکتی ہیں مگر کل کے قاری کے لئے وہ اتنی ہی اہم ہوں گی جتنی ٹیکسلا یا موہنجو داڑو سے برآمد ہونے والی چھوٹی چھوٹی اشیاء۔ مستقبل کا محقق اس کے ایک ایک لفظ پر تجزیے کی کدال مارے گا۔

اس لحاظ سے محترمہ انور رضا صاحبہ نے اپنی آئندہ نسلوں کو وہ قرض ادا کر دیا ہے جو ہر عینی شاہد کے لئے ادا کرنا فرض ہے۔ پاکستان کے سات کروڑ شہری اس قومی سانحہ کے عینی شاہد ہیں کسی نے دور سے دیکھا تو کسی نے قریب سے، اور دیکھنے والی ہر آنکھ ٹپکی ہے۔ خدا دوسروں کو بھی توفیق دے کہ مصنفہ کی مثال کی تقلید میں اس آنسو کی نمی میں قلم ڈبو کر آنے والے کل کے لئے کچھ نہ کچھ محفوظ کر جائیں۔ یہ موقع ادبی اصناف کی بندشوں یا ادبی معیاروں کی موشگافیوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ پرورشِ لوح و قلم کرنے والے لوگ جس انداز میں چاہیں، لکھیں۔ کیونکہ شہادت کی اہمیت اس کے اسلوب میں نہیں بلکہ اس کی صداقت اور خلوص میں ہوتی ہے۔ اور جہاں خلوص اور سچائی ہو وہاں نئے اصنافِ ادب اور نئے اسلوب بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج کا قاری جو چاہے سو کہے۔ مگر میں محترمہ انور رضا صاحبہ کو آئندہ نسلوں کی طرف سے مرحبا کہنا چاہتا ہوں۔

مسعود مفتی

اسلام آباد

۲۳ اگست ۱۹۷۶ء

حصّہ اوّل

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

میری شادی تو ایک فوجی افسر سے ہوئی تھی مگر ہم دونوں کی مشکل پسند طبیعتوں نے چین سے زندگی گزارنا گوارا نہ کی اور میرے شوہر سنٹرل سپیریر سروسز کے مقابلے کا امتحان دے کر سول میں آ گئے۔ اچھا بھلا بنا بنایا گھروندا پھر منتشر ہو گیا۔ میرے شوہر سول سروس اکیڈمی لاہور میں تربیت کے واسطے چلے گئے۔ اور میں ننھے سے بچے کو لے کر والدین کے ہاں پھر ان ہی شب و روز میں محو ہو گئی۔

یہ ۱۹۵۵ء کا وسط تھا کہ میرے شوہر نے آ کر بتایا کہ جولائی میں چھ ماہ کی تربیت مشرقی پاکستان میں ہو گی۔ کیونکہ مرکزی حکومت کی انتظامیہ کے افسروں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ملک کے دونوں بازوؤں سے یکساں طور پر واقف

ہوں۔ اسی لئے مشرقی پاکستان کے اضلاع میں چھ ماہ کی تربیت ضروری قرار دی گئی اور پھر رضا نے یہ خوش خبری سنائی کہ فیملی کو بھی ساتھ جانے کی اجازت ہے۔ بس میں نے خوشی خوشی رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ حالانکہ اپنے ملک کے ایک علاقے میں جا رہے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے کسی دوسری دنیا میں جا رہے ہوں۔ میں ضلع جہلم کے ایک قصبے کے قدامت پسند گھرانے کی لڑکی جس کی سیاحت لاہور کالج سے آگے نہ گئی تھی۔ خود کو کولمبس یا واسکوڈی گاما سے کم نہ سمجھ رہی تھی۔ جیسے واقعی ایک نئے کرۂ ارض کی دریافت کا بیڑہ مجھے ہی سونپ دیا گیا ہو۔ اتفاق سے ان ہی دنوں جہلم کی ایک اور لڑکی اقبال اپنے شوہر کے ساتھ ڈھاکہ میں مقیم تھی۔ اس کے شوہر کیپٹن صادق ای۔پی۔آر (ایسٹ پاکستان رائفلز) میں تعیّنات تھے۔ مارا مار اسے خط لکھ کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ غالباً وہ میرے خط سے ہی میری گھبراہٹ بھانپ گئی تھی۔ اسی لئے شائد اس نے اپنے جوابی خط میں بہت تسلی اور دلاسے دیئے کہ وہ خود مجھے ایئرپورٹ سے اپنے گھر لے جائے گی اور جب تک میرے شوہر رہائش کا مناسب بندوبست نہ کر لیں وہ مجھے اپنے پاس ہی رکھے گی۔

جولائی کے اوائل میں لاہور سے ہمیں لے کر ہوائی جہاز جو اڑا تو ہندوستان پر سے پرواز کرتا ہوا ڈھائی گھنٹے میں سیدھا ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترا۔ ہوائی جہاز سے اترتے ہی گویا واقعی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہ دنیا میرے پنجاب سے بالکل مختلف تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے ایلس کی طرح میں ایک ونڈرلینڈ میں آ گئی ہوں۔ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی بارش ہو کر تھمی تھی۔ مگر جھکے ہوئے گہرے سرمئی رنگ کے ابر پارے پھر موسلا دھار برسنے کو تیار نظر آ رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی خوشبو جو قدرت نچھاور کر رہی ہو جو

پانی، مٹی اور سبزے کی اصلی رُوح کا مرکب ہو۔ ایسی خوشبو جس کو کوئی نام نہ دیا جا سکے مگر جو اپنے طلسم کے حصار میں ذہن اور دماغ کو مقید کرلے۔ جو خوابوں کی دنیا کا پتہ دے۔ ہر شے سوئی سوئی قدرت کی ہمنوا بن کر عجیب اجنبی سا حسُن پیش کر رہی تھی۔ وہ حسن جو انسانی ہاتھوں کی صناعی کا مرہونِ منت نہ ہو۔ یک دم مجھے احساس ہونے لگا کہ اجنبی ماحول کے لوگ بھی تو مختلف ہیں۔ دل گھبرانے لگا اور آنکھیں ہر چیز کا جائزہ لینے لگیں۔ سانولے رنگ کے چھوٹے قد، انسانوں میں مجھے لحیم شحیم کیپٹن صادق اور اقبال کو ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقّت نہ ہوئی۔ ان دونوں کے بے حد خلوص اور اپنائیت نے ماحول کی اجنبیت کو یکسر بدل دیا۔ میں نے فضا کی خوش گوار باس کو پھر سانسوں میں بسا لیا۔ پنجاب میں تو گرمی، حبس اور لُو پریشان کر رہے تھے اور پھر پریوں کی کہانی والا اڑن کھٹولا اس خوش گوار، نم دار ٹھنڈی فضا میں لے آیا۔

مجھے ہر چیز عجیب سی لگ رہی تھی اور میں جیسے خواب ہی خواب میں چل کر موٹر میں بیٹھی۔ جونہی موٹر روانہ ہوئی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ راستہ میں پہلے تو کافی دیر تک سوائے چاروں طرف گھیرے سبز رنگ کے درختوں، پودوں اور دیگر روئیدگی کے کچھ اور نظر نہ آیا۔ مگر شہر میں گھستے ہی زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔ موسلا دھار بارش سے کچھ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اکثر لوگ چاکلیٹی رنگ کے جسم پر صرف چھوٹی سی لنگی باندھے ہوئے یوں جا رہے تھے جیسے ابر و باراں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ سائیکل رکشا پر کئی کئی سواریاں بٹھاتے ہوئے یہ دُبلے پتلے انسان مجھے اتنے اچھے لگے جیسے قدرت کے حسن کا یہ بھی ایک لازمی جزو ہوں۔ میری آنکھیں تو گھوڑا اور تانگہ دیکھنے کی عادی تھیں۔ یہ سائیکل رکشا میں مشقت کرنے والے انسان میری نظروں کے لئے

بالکل نئے اور اجنبی تھے۔ گاہے گاہے کچھ خوش حال اشخاص لنگی کے ساتھ گینجی (بنیان) پہنے ہوئے اور چھتری ہاتھ میں لیے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔

شہر سے گزر کر ہم فیل خانے میں داخل ہوئے۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں ای۔پی۔آر کے افسران رہتے تھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں یہاں ہاتھی رہا کرتے تھے لیکن اب تو ہر طرف خوبصورت بنگلوں کی قطاریں دکھلائی دیتی تھیں۔ ان ہی بنگلوں میں سے ایک میں ہم داخل ہو گئے۔ "ہائے اللہ! کتنا خوبصورت گھر ہے اقبال کا۔" میں ہر چیز کو ستائشی نظروں سے دیکھتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ بانس اور بید کے صوفے اور کرسیاں بہت ہی پیاری طرز کے بنے ہوئے تھے۔ اور انہیں بانس کی بنی ہوئی باقی آرائشی چیزوں اور مٹی کے گلدانوں کے ساتھ اقبال نے اس خوبصورتی کے ساتھ سجایا ہوا تھا کہ میں اقبال کے سلیقے کی قائل ہو گئی۔

فیل خانے میں ہم لوگ تقریباً سات دن رہے۔ ای۔پی۔آر میں کمیشن افسر تقریباً سارے ہی مغربی پاکستان کے تھے اور یہاں رہائش کی دوسری سہولتوں کے علاوہ تنخواہ بھی مغربی پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ملتی تھی۔ لہٰذا یہ افسران بہت خوش تھے۔ گھر کے اندر سوائے بنگالی ملازموں کے، جو اردو ہی بولتے تھے، باقی ماحول مانوس تھا۔ کیپٹن صادق کے تقریباً تمام دوست آرمی اور سول آفیسر تھے جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہی کھانے، وہی زبان، وہی مخصوص نقرے۔ میرے اندر جو خوفِ اجنبیت تھا، ایک دم سے ختم ہو گیا۔

اقبال کے پڑوس میں ایک پٹھان کرنل قاضی رہتے تھے وہ بھی ای۔پی۔آر میں ملازم تھے۔ دونوں میاں بیوی اس قدر عمدہ اور پرخلوص تھے کہ مل کر طبیعت خوش ہو گئی۔ یہ لوگ کئی برس سے ڈھاکہ میں رہتے تھے۔ مگر بنگالی نہیں بول

سکتے تھے ۔ درحقیقت نہ یہ افسران اور نہ ان کی بیگمات بنگالی جانتے تھے ۔ ویسے انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ فیل خانے کے علاقہ میں رہ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ مغربی پاکستان کا ایک جزیرہ ہو ۔ مگر میں تو اس خوبصورت جزیرہ میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتی تھی ۔ مجھے تو اجنبیت کے سمندر میں ہی جانا تھا ۔ اس لئے کہ میرے میاں کو تو اس سمندر کا ایک ملاح بننا تھا ۔ لہٰذا رمنا ریسٹ ہاؤس میں ایک کمرہ کرا لینے پر لے لیا گیا ۔ تمام زیر تربیت افسران وہیں قیام پذیر تھے ۔ اقبال کے گھر سے میں یوں ریسٹ ہاؤس آئی جیسے کوئی لڑکی غیروں میں بیاہ کر پہلی مرتبہ وداع ہو کر سسرال جاتی ہے ۔

رمنا ریسٹ ہاؤس میں ہم سب کو ایک ایک کمرہ اور غسل خانہ مل گیا ۔ اقبال میرے ساتھ آئی اور ساتھ مل کر کمرہ کو ترتیب دینے لگی ۔ یہ کمرہ ایک چھوٹا سا فلیٹ ہی تھا ۔ بیٹھنے کے لئے آرام کرسیاں ترتیب دے کر ایک بیٹھک سی بنا لی اور ایک کونے میں میز کے گرد چار کرسیاں لگا کر کمرۂ طعام بنا لیا اور یوں مجھے سیٹل کروا کر اقبال اپنے گھر سدھاری اور میں نے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کیا ۔

اس ریسٹ ہاؤس کی دنیا بھی عجیب تھی ۔ اس میں ہر نوع اور طبقے کے لوگ موجود تھے ۔ اسمبلی کے ممبران بھی تھے اور سیاست دان بھی ، تاجر بھی اور سرکاری ملازم بھی اور نہ معلوم کون کون ۔ اوپر کی منزل فیملی والوں کے لئے اور نیچے کی منزل "مجرد" حضرات کے لئے مخصوص کر دی گئی ۔ رضا کے بیچ کے چار افراد بیوی بچوں کے ساتھ اوپر کی منزل پر مقیم تھے ۔ اشرف صاحب بہار کے رہنے والے تھے اور اب مغربی پاکستان کے افسر تھے ۔ اپنے چار بچوں ، اہلیہ اور والدہ کے ساتھ برابر والے کمرہ میں مقیم تھے ۔ میر علی نظیر "منفرد مزاج" کے بنگالی افسر تھے ۔ نہایت پُرخلوص ، صاف گو اور سادہ طبیعت کے مالک ۔ ان کے دو بیٹے تھے ،

جن کے نام انہوں نے عجیب و غریب چوں چوں رکھے ہوئے تھے۔ ایک کا نام برمی تھا اور ایک ملیشین۔ وجہ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ ان ناموں کے حضرات اپنے اپنے ملکوں میں بہت بیدار مغز اور بلند پایہ لیڈر گزرے ہیں۔ میرے منہ پر ان پیارے بچوں کے نام کبھی نہ چڑھے۔

قاضی مشرف حسین چٹاگانگ کے قریب سندیپ نامی ایک جزیرے کے رہنے والے تھے۔ اپنی بیوی شاہانہ اور ایک بیٹے کے ساتھ قریب والے کمرہ میں تھے۔

رلیسٹ ہاؤس کے باورچی خانہ میں سب کے لئے اکٹھا کھانا بنتا تھا اور پھر بیرے وقت پر سب کے کمروں میں کھانا لے آتے تھے۔ کسی کو انتخاب کرنے یا فیصلہ کرنے کا حق نہ تھا۔ جو کچھ پکتا وہی کھانا پڑتا۔ دونوں وقت موٹے چاول اور دُھلی ہوئی مسور کی دال ضرور ہوتی۔ اس کے علاوہ مرغی، گوشت، مچھلی غرضیکہ سب ہی کچھ ہوتا۔ مگر ہر چیز غیر مانوس مزہ لئے ہوئے۔ سب بیرے اور دیگر ملازم اُردو بولتے اور بہت خلوص سے پیش آتے۔ اس لئے ہر چیز پیاری لگتی۔ غیر مانوس چیزوں میں بھی ایک اچھوتی لذّت محسوس ہوتی۔ اجنبیت میں بھی اپنائیت تھی۔ ہر شخص دوست لگتا۔ ہر وقت مدد کے لئے تیار۔ صبح ناشتے کے بعد میرے میاں کام پر چلے جاتے تو میں بچے کو تیار کر کے علی کے ساتھ رلیسٹ ہاؤس کے احاطہ میں کھیلنے کے لئے بھیج دیتی۔ علی ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا۔ جس کو کیپٹن صادق کے اردلی نے میرے بیٹے پپّو کے ساتھ کھیلنے کے لئے ملازم رکھ دیا تھا۔ میں خود کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ ابھی تک ڈھاکہ ایک معمولی سا شہر تھا۔ مگر چاروں طرف شاندار قسم کی عمارات زیرِ تعمیر تھیں۔ مزدور اِدھر اُدھر پھرتے ہوتے۔ سیمنٹ اور بجری ملانے والی مشینوں کے شور اور کام میں مصروف بنگالی کاریگروں اور مزدوروں کی مخصوص آوازوں سے پرے سبزہ نظر

آنے لگتا۔ مجھے ہر چیز کو دیکھنے میں مزہ آتا۔ چھوٹی چھوٹی گائیں اور بکریاں تو بس بلّی جتنی۔ سر پر بڑے بڑے فضلی آموں کا ٹوکرا رکھے وہ چھوٹا سا بنگالی اور سرخ سبز کنارے والی ساڑھی پہنے ہوئے سر کو پوری طرح ڈھانپے بنگالی عورتیں کام میں ہر وقت منہمک دکھائی دیتیں اور پھر آتے جاتے مختلف قسم کے لوگ سادہ کپڑوں میں ملبوس اور بلبیشتر سوائے لنگی کے ہر چیز سے بے نیاز، ہر تصنّع سے پاک۔ خدا کی وہ سادہ مخلوق جسے صرف کھانے کے لئے پیٹ بھر کر دال بھات مل جائے اور بس .... کوئی اور خواہش نہیں۔ کبھی کبھار ہم سائیکل رکشا میں بیٹھ کر فیل خانے دوستوں سے ملنے جاتے تو وہاں کا پرتکلف اور سہولتوں اور آسائشوں سے پُرماحول، اس سادہ ماحول سے واضح طور پر مختلف لگتا۔ یوں جیسے ایک شہر میں دو تہذیبیں ایک ساتھ پروان چڑھ رہی ہوں۔ جن کا نہ صرف معیار زندگی میں فرق ہو، بلکہ پیمانہ معیار بھی جُدا جُدا۔

ابھی ڈھنگ سے ماحول سے آشنائی بھی نہ ہوئی تھی کہ زیر تربیت افسران کو مختلف اضلاع میں بھیجنے کا سرکاری حکم آیا۔ تین تین افسروں کو ایک ساتھ متعین کیا گیا تھا۔ ہماری جائے تربیت چٹاگانگ تھی۔ ہم تین افسر جو ساتھ جا رہے تھے سب کے سب شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ ہمارے ساتھی مشرف حسین اور قاضی جلال تھے۔ قاضی جلال ڈھاکہ میں اپنے سسرال میں رہا کرتے تھے۔ ان کے سسر ڈائرکٹر آف ایگریکلچرل تھے۔ جلال ہر محفل اور جگہ اپنے سسر کا ذکر فخریہ انداز میں کرنا کبھی نہ بھولتے اور اپنی اس حیثیت کو باقی بنگالی ساتھیوں سے علیحدہ اور منفرد بنا کر بتاتے۔ یہ واحد بنگالی افسر تھے جو خود پر تہذیب کی بناوٹ کا خول چڑھانے کی کوشش کرتے۔ ورنہ باقی تمام بنگالی افسران مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ خالص مشرقی اندازِ زندگی اور اقدار کے آئینہ دار تھے۔

اس طرح ہم تین خاندان ڈھاکہ سے نئی منزل چٹا گانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ اگست کا اوائل تھا۔ موسم بہت خوش گوار مگر مرطوب تھا۔ ٹرین گھر گھر کر کے چل رہی تھی اور میں کھڑکی میں سے سر نکالے دُور دُور تک سبزہ ہی سبزہ دیکھ رہی تھی۔ سبزہ اور پانی ... پانی اور سبزہ۔ کہیں کہیں کیلے کے درخت کے تنے سے بنائی ہوئی کوئی کشتی کھیتوں میں سے گزرتی دکھائی دیتی اور بس۔ اسٹیشن آتے تو سوچتی کہ دیکھیں اب تو بنگال کی کثیر آبادی کی رونق کا مظاہرہ دیکھیں گے۔ مگر اجاڑ سے اسٹیشن۔ کوئی کھانے کی چیز نہیں سوائے مقامی بدمزہ کیلے یا ڈاب کا پانی (کچے ناریل کو ڈاب کہتے ہیں) کھانے کے وقت جو کھانا آیا تو ردنے کو جی چاہنے لگا۔ تمام راستے بور ہوئی۔ چاروں طرف سبزہ اور پانی کی یکسانیت نے اتنا طبیعت کو بیزار کیا کہ میں اپنے پنجاب کی خشک وادیوں کو ترسنے لگی۔ وہ ہر اسٹیشن پر رنگا رنگ چیزیں، مخصوص صدائیں، کہیں گرم چائے اور کہیں ٹھنڈے مشروب۔ مجھے پورے ماحول سے وحشت ہونے لگی اور جب اکتاہٹ عروج پر پہنچی تو چٹا گانگ کا خوبصورت اسٹیشن آگیا اور ناظر صاحب (ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے مہتمم) ہمیں لینے کے لئے ہمارے کمپارٹمنٹ میں آگئے تو بیزاری ایک دم کافور ہوگئی۔ ہائے اللہ یہ کتنی اچھی جگہ ہے اور کتنے اچھے لوگ ہیں۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا کہ ہماری موٹر چٹا گانگ سرکٹ ہاؤس میں داخل ہوئی۔ یہ عمارت اس قدر پُرشکوہ اور عالیشان تھی کہ مسرت اور خوشی سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ناظر صاحب ہماری رہبری کرتے ہوئے نچلی منزل کے بائیں بازو والے پہلے کمرے میں لے آئے۔ تین طرف سے بڑے بڑے برآمدوں سے گھرا ہوا یہ بہت ہی شاندار اور کشادہ کمرہ تھا۔ اونچے اونچے قدیم طرز کے دروازے

ڈیڑھ فٹ موٹی دیواریں اور لوہے کے موٹے گرڈروں سے بنی ہوئی بہت اونچی چھت انگریزوں کی تعمیر کردہ سرکاری عمارتوں کی شان و شوکت و پختگی کا پتہ دے رہی تھی۔ اچھی طرح پالش شدہ وکٹورین طرز کا بھاری فرنیچر۔ بس راستہ کی ساری الجھن کا مداوا بن گیا۔

کمرہ میں سامان رکھوا ہی رہی تھی کہ سرکٹ ہاؤس کا بٹلر اپنی تمام فربہی کا مظاہرہ کرتا ہوا آ گیا۔ یہ شخص موٹا ضرور تھا مگر بہت ہنس مکھ اور کام کرنے والا انسان تھا۔ بٹلر کے ساتھ ہی باورچی بھی یہی تھا۔ باتیں ایسی لچھے دار کرتا تھا کہ ہر نیا آنے والا اسے بہترین باورچی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ رات کا کھانا کمرہ ہی میں کھایا۔ ڈھاکہ کے مقابلے میں کھانے کا معیار یقیناً بہت بہتر تھا اور بٹلر اس خوبی کا سہرا اپنے ہی سر لیتا۔ یہاں لوگ کم تھے۔ ہم تین افسران کے خاندان تو مستقل مقیم تھے۔ کبھی کبھار کوئی اور افسر بھی دورے پر آ جاتا تو بٹلر نہایت مستعدی سے اس کے کھانے کی دیکھ بھال میں لگ جاتا۔ اکثر کھانے کے معیار اور مزے کے متعلق ہم سے پوچھتا رہتا اور پھر خود ہی اپنی تعریف بھی شروع کر دیتا۔

دوسرے روز میرے شوہر جب کام سے واپس آئے تو چار بجے تینوں افسران بیویوں سمیت ڈپٹی کمشنر کے یہاں کال آن کے لئے گئے۔ ان دنوں چٹاگانگ کی سول انتظامیہ کے اعلیٰ افسر سبھی مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے رفعت پاشا شیخ جو کہ پنجاب کے رہنے والے تھے ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز تھے اور حسن صاحب جو کہ مہاجر تھے اس علاقہ کے کمشنر تھے۔ مقامی اعلیٰ افسران پر کال آن کرنا بھی تربیت کا ایک حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ معاشرتی آداب اور رکھ رکھاؤ بھی اس تربیت کا ایک جزو تھا اور ہم بیویوں کو بھی لازم تھا کہ شوہر

کی ملازمت کے ان معاشرتی آداب سے واقفیت حاصل کریں۔

موٹر آ گئی اور ہم سب روانہ ہوئے۔ ایک سرسبز پہاڑی پر پیچ دار راستہ طے کرتی ہوئی موٹر پاشا صاحب کے گھر میں داخل ہوئی۔ پاشا صاحب اور ان کی بیگم منتظر ہی تھے۔ اس طرح تپاک سے ملے جیسے کوئی بچھڑا ہوا عزیز ایک مدّت کے بعد نظر آیا ہو۔ پاشا صاحب ایک سینیئر افسر تھے۔ وضعدار، بارو ایت اور عمدہ اخلاق کے مالک۔ تھوڑی دیر کی گفتگو میں ہم سب اس سرخ و سفید بارعب شخصیت سے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ ان کے روّیے میں افسری کا طنطنہ نہ تھا بلکہ ایک بڑے بھائی کی محبت اور بزرگ کی شفقت تھی۔ وہ ایسے معمر تو نہ تھے مگر انجانے طور پر ہم سب کے سرپرست بن گئے۔ کم از کم مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ اپنے گھر سے ہزاروں میل دور ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک عزیز کی شفقت کا سایہ ہم پر موجود ہے۔ اور اس طرح جہاں سرکاری کام کی تربیت پاشا صاحب نے ان افسران کو دینا شروع کی وہاں بیگم پاشا نے ہم تینوں خواتین کا چارج لے لیا۔ اکثر موٹر بھیج کر بلوا لیتیں۔ سوشل تقریبوں پر اور لیڈیز کلب میں ساتھ لے جاتیں۔ ہر ایک کے ساتھ متعارف کرواتیں۔ بالکل بڑی اور شفیق بہن کی طرح۔ جس دن پاشا صاحب اپنی بیگم کے ساتھ سرکٹ ہاؤس آ جاتے اور ہم تینوں کے کمروں میں باری باری جاتے۔ اس روز بٹلر اور بیرے ہمیں خاصی اہمیت دینے لگتے اور ہماری گردنیں فخر سے تن جاتیں۔ ورنہ زیر تربیت افسروں کو سرکٹ ہاؤس کے یہ ملازم کم ہی گھاس ڈالتے۔ سچ پوچھئے تو ملازمت کے معاشرتی آداب کی تربیت جو پاشا صاحب نے ہمیں دی۔ اسے میں نے ہمیشہ ملازمت کا قرض سمجھا اور جب بعد ازاں میرے شوہر سینئر ہوئے اور زیر تربیت افسران ہمارے پاس آنے لگے تو ہمیشہ میں نے اس قرض کو چکانے کی کوشش کی۔

مگر میرے خیال میں پاشا صاحب اور بیگم پاشا کی کاملیت کو شاید کبھی نہ پہنچ سکی۔

تینوں سول افسران کے خاندان وہاں جاکر ایک اکائی بن گئے تھے۔ کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ ہم لوگ مختلف مقامات کے رہنے والے ہیں۔ ہم تو سب پاکستانی تھے اور ایک ملازمت کے رشتہ میں منسلک تھے۔ یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ہم جدا جدا زبان بولنے والے اور جدا جدا کلچر کے حامی ہیں۔ فی الحال تو خلط ملط ہو کر ہم ایک خاندان بن چکے تھے۔ یہ خاندان زیرِ تربیت افسروں کا خاندان تھا اور اس کے سرپرست پاشا صاحب تھے۔ ہم کسی خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اور ہم سب کے وہ یکساں طور پر بزرگ تھے

باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا

ہم زباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیورِ گلزار

بغیر کسی تخصیص یا تمیز کے ہمارا یہ خاندان ہر جگہ ایک ساتھ جاتا اور ہر کام ایک ساتھ کیا جاتا۔

ہمارے کمرے سے ملحق مشرف حسین صاحب رہتے تھے۔ ان کی بیگم چٹاگانگ ہی کے دُور افتادہ چھوٹے سے جزیرے کی رہنے والی ایک ناخواندہ خاتون تھیں وہ اردو کا ایک لفظ بھی نہ بول سکتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی لفظ سمجھ ضرور لیتیں۔ مگر ہمارے درمیان زبان کا مسئلہ کبھی دیوار نہ بنا اور زبان کی بنیاد پر ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہ ہوا۔ حالانکہ ۱۹۵۲ء میں بنگالی زبان کی تحریک چل نکلی تھی اور شہداء کے خون سے سینچی بھی جا چکی تھی۔ مگر یہ تحریک ابھی تک سیاسی سطح سے نیچے نہیں آئی تھی۔ انفرادی سطح پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ نہ تعلیم یافتہ طبقے پر اور نہ غیر تعلیم یافتہ افراد پر۔ اس کا ذکر کبھی کبھار ہوتا، مگر محض مذاقاً . . . . مثلاً کبھی ان دنوں ہمارے گھروں میں بچے جمع ہو کر "جلوس جلوس" کھیلا کرتے تھے۔ جس کا

نمایاں ترین نعرہ یہ ہوتا "پولیشیر جُلم چولبے نا" (یعنی پولیس کے ظلم کو چلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی) ان "جلوسوں" میں میرا بیٹا بچو بھی توتلی زبان میں نعرے لگاتا ہوا شامل ہو جاتا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ڈھاکہ کے جلوس پر جو گولی چلائی گئی تھی اس میں دو طلبا رمارے گئے تھے اور دونوں زبان کے شہید اور ہیرو مانے جاتے تھے۔ اس گولی چلانے کے واقعے کا مذاق تو اردو کے شعراء نے بھی اڑایا۔

چونکہ بارش کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا لہٰذا ہم لوگ اکثر شامیں اپنے کمروں میں یا برآمدے میں اکٹھے بیٹھ کر گزارتے۔ مشرف اپنی بیگم کو جدید تہذیب کے آداب کے علاوہ برج کھیلنا بھی سکھلا رہے تھے۔ وہ ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتے اور اسے اپنے نئے معیار پر لانے کی کوشش کرتے۔ شاہانہ بھی بنیادی طور پر ذہین تھی اور بہت جلد ہر چیز کو اپنا رہی تھی۔ مجھے مشرف کی یہ بات بے حد پسند آئی۔ کیونکہ میری نظروں نے تو یہی دیکھا تھا کہ اِدھر میاں صاحب بہادر بنے، اُدھر گاؤں کی بیوی کو دھتکارا اور نئی شادی کر کے ترقی یافتہ ہونے کا ثبوت دینے لگے۔ شام کو کبھی برج چلتی یا تاش کا کوئی اور آسان کھیل کھیلا جاتا۔ کبھی کبھار رِم جھم کرتی ہوئی برسات میں کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑوں میں سے جھانکتے ہوتے چاند کو دیکھ کر مشرف کا گانے کا موڈ بن جاتا، اور ہم سب کے اصرار پر شاہانہ بھی بھٹیالی راگ میں مانجھیوں کا بنگالی گیت چھیڑ دیتی اور یوں لگتا جیسے چھن چھن کر آنے والی چاندنی اور بارش کے قطرے بھی اس کے ہمنوا بن گئے ہوں .... علامہ اقبال کا یہ شعر میرے کانوں میں گونجنے لگتا ؎

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

اور اس سمے ساڑھی کا پلّو سختی سے اپنے گرد لپیٹے ہوئے وہ معصوم سی لڑکی مجھے

بہت پیاری لگنے لگ جاتی۔

قاضی جلال کے سسر کی ڈائرکٹری ہر جگہ اس کے کام آجاتی۔ یہاں بھی اس نے بالاتی منزل کے دائیں بازو کا پہلا شاندار وی۔ آئی۔ پی روم لے کر اپنی امتیازی حیثیت کا لوہا منوالیا۔ مسز جلال بہت فخر سے کہا کرتیں کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنے چٹاگانگ کے قیام کے دوران اسی کمرہ میں رہا کرتی ہیں۔ اس بات پر ہم مزید مرعوب ہو جاتے۔ مسز جلال دو ملازم عورتیں بھی اپنے ساتھ ہی لائی تھیں لہٰذا کھانے پکانے کا بندوبست بھی جداگانہ ہی کر رہی تھیں۔ ایگریکلچر کے محکمے کا ایک چپڑاسی بھی ان کا سودا سلف لانے کے لئے روزانہ آتا۔ چونکہ وہ دونوں بہنیں ہی والدین کی کل اولاد تھیں۔ اس لئے مسز جلال بڑی ہونے کے ناطے سے والدین کو بے حد عزیز تھیں ان کے والد اکثر و بیشتر دورے پر آجاتے اور اس طرح انہیں چند مزید سہولتیں بھی میسر ہو جاتیں۔ یہ سب کچھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ لیکن وہ زیر تربیت افسروں کے خاندان کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے باہر اور اندر کے ہر پروگرام میں برابر کے شریک تھے پاشا صاحب کے حکم کے مطابق ہم سب کمشنر پر کال کرنے گئے۔ مگر یہ خالصتاً ماتحتوں اور افسروں کی ملاقات تھی۔ مسز حسن کی اپنی ہی ایک دنیا تھی۔ ان کی اولاد نہ تھی۔ مگر ان کے دو جوان بھانجے اولاد کی طرح رہتے تھے۔ علی الصبح ان کے ہمراہ وہ ٹینس کھیلنے کلب جاتیں۔ سوئمنگ بھی کرتیں۔ برقعہ بھی لیتیں اور مخلوط محفلوں میں شرکت بھی کرتیں۔ وہ نئی اور پرانی روایات کا عمدہ دھوپ چھاؤں کا گلے ملتا ہوا ملاپ تھیں۔ ہمارا ان کے ساتھ صرف یہ تعلق تھا کہ کہیں مل گئے تو جھک کر آداب کر لیا اور بس۔

گو ہم کچھ بھی نہ تھے مگر پاشا صاحب نے اس قدر اہمیت دے رکھی تھی کہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ چٹاگانگ میں کوئی تقریب ہو اور ہم سب کو مدعو نہ کیا جائے۔ بلکہ

مقامی صاحب ثروت حضرات اور سینئر افسروں کو کہہ کہہ کر ہماری خاص دعوتیں کرواتے اور ان کے بقول ان کا گھر تو ہمارا اپنا ہی گھر تھا۔ جب چاہا چلے گئے۔

ان دنوں چٹاگانگ کی معاشرتی زندگی پر مغربی پاکستان کے حضرات چھائے ہوئے تھے۔ سول انتظامیہ کے اعلیٰ افسران، ریلوے ہیڈ کوارٹر کے افسر اور کسٹم کے حکام سب کے سب مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگالیوں کے جو تین خاندان معاشرتی ماحول کا ایک حصہ تھے ان میں ایک ڈی آئی جی پولیس ادریس صاحب کا خاندان تھا۔ مسز ادریس برج کی رسیا تھیں۔ شام کے وقت وہ کسی گھر میں ہوں یا کلب میں، برج ٹیبل پر بیٹھ جاتیں اور رات گئے اٹھتیں۔ دوسرا خاندان اے کے خان کا تھا جو ایک بڑے صنعت کار تھے۔ بنگالیوں میں سب سے زیادہ صاحب ثروت اور صاحب طرز انسان تھے۔ ان کے وسیع و عریض بنگلے کی ہر چیز ان کی بیگم کے اعلیٰ ذوق کی ترجمان تھی۔ باغ کی ترتیب اس قدر خوبصورت اور احاطے کی باڑ کی کٹائی اس قدر کمال مہارت سے کی گئی تھی کہ میں تو ہر چیز کو آنکھیں پھاڑے دیکھا کرتی تھی۔ تیسرا خاندان پورٹ کے انچارج بارکی صاحب کا تھا۔ یہ مشرقی پاکستان کے آخری گورنر ڈاکٹر مالک کے بھائی تھے۔ بہت کم گو اور کم آمیز۔ ان کی بیگم کو میں نے ہمیشہ بنگالی طرز کی سوتی ساڑھی میں بغیر کسی میک اپ کے دیکھا۔ اس سادگی میں وہ باوقار اور مشرقی روایات کی تصویر نظر آتی تھیں

ادریس صاحب اور اے کے خان صاحب، پاشا صاحب کے قریبی دوست تھے اور تقریباً ہر شام یہ تینوں خاندان اکٹھی گزارتے تھے۔ پاشا صاحب کی وجہ سے یہ حضرات ہمیں بھی کبھی کبھار مدعو کر لیتے تھے۔

بنگالی سول سرجن ڈاکٹر لشکر سے ہماری دوستی عجیب حالات میں ہوئی۔ رات کی ایک تقریب میں ہم مدعو تھے۔ میں بچے کے بخار کے باعث نہ جاسکی۔ پاشا

صاحب کو معلوم ہوا تو اسی وقت ڈاکٹر شکر کو فون پر سرکٹ ہاؤس آکر بچے کو دیکھنے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب سخت بیزاری کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے آئے بے وقت بھیجے جانے پر سخت ناراض تھے۔ پہلے تو پاشا صاحب کو بے نقط سنائیں اور پھر یک دم ہمارے دوست بن گئے ... بہت پیارے دوست

ان ہی دنوں چین سے خواتین کا ایک وفد آیا۔ یہ اپوا کی طرح وہاں کی خواتین کی تنظیم کا وفد تھا۔ یہ چٹاگانگ بھی آیا۔ اس وفد کی سربراہ خاتون چین کی ڈپٹی ہیلتھ منسٹر تھیں۔ ایک خاتون ممبر وہاں کے ڈپٹی پرائم منسٹر کی بیوی مگر خود ڈائرکٹرس آف ایجوکیشن تھیں۔ ایک خاتون جسٹس آف ہائی کورٹ تھیں۔ تعارف کے دوران ان خواتین میں سے ہر ایک کو انکی ذاتی استعداد اور حیثیت سے متعارف کرایا جاتا۔ اور ہمارا تعارف کچھ اس طرح ہوا۔" ان سے ملئے یہ فلاں افسر اعلیٰ کی بیگم ہیں اور یہ فلاں تاجر کی بیگم ہیں۔" ہماری خواتین اپوا کی ممبران بھی تھیں۔ مگر سچ پوچھئے، تو پہلی مرتبہ مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوا۔ ان ٹھوس شخصیات کے سامنے اپنی خواتین بالکل ایسے غباروں کی طرح لگیں جن کی ڈور ان کے شوہروں کی باوزن حیثیت سے باندھ دی گئی ہو۔

ایک روز اچانک ہی ایک محفل میں مجھے اپنی عزیز سہیلی سہیلہ ملی۔ یہ ہمیشہ سے بہت عمدہ ذوق کی مالک رہی ہے۔ بہت تپاک سے ملی اور میرے کان میں آکر کہنے لگی

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اور فرطِ جذبات سے ایک مرتبہ پھر ہم دونوں بغلگیر ہوگئیں۔ چٹاگانگ چند لمحوں کے لئے لاہور بن گیا اور ہم ساری محفل سے بے نیاز ہوکر کونے میں اپنی پرانی باتیں یاد کرنے لگیں۔

سہیلہ کے شوہر خالد عزیز ریلوے میں انجینئر تھے۔ پہاڑتلی میں بے شمار خوبصورت بنگلوں کے مجموعے کے درمیان ایک کوٹھی میں اپنی ننھی سی نہایت ہی پیاری بیٹی مینا کے ساتھ رہتے تھے اور وہاں کے رہنے والے تمام لوگ یا تو ریلوے کے حکام تھے یا کارندے۔ دراصل یہ ریلوے ملازمین کی کالونی تھی۔ سہیلہ کی وجہ سے ہم لوگ اکثر وہاں جاتے۔ ان لوگوں کے دوستوں سے ملاقات ہوتی۔ ریلوے کے حکام میں بھاری اکثریت اردو بولنے والوں کی تھی۔ اگر کوئی بنگالی افسر تھا تو ہم اس سے نہیں مل سکے۔ چٹاگانگ کی یہ بستی بھی بنگال کے باقی علاقہ سے علیحدہ اردو بولنے والوں کا ایک جزیرہ سا بن گئی تھی۔

میری ایک رشتہ دار خاتون نادرہ کے میاں کرنل تھے۔ وہ بھی ان ہی دنوں چٹاگانگ میں متعین ہوئے تھے۔ ایک دن ہم ان سے ملنے نوتن پارہ (چٹاگانگ کی چھاؤنی) گئے۔ ابھی چھاؤنی کی تعمیر کا آغاز تھا۔ بالکل اجاڑ سا علاقہ لگتا تھا۔ کوارٹر تعمیر ہو چکے تھے۔ لیکن افسروں کی رہائش کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ جو افسر اپنے بچوں کو لانا چاہتے انہیں دو کمروں کے کوارٹروں میں رہنا پڑتا۔ نادرہ سخت بیزار تھی۔ اس کا محبوب موضوعِ گفتگو مغربی پاکستان واپس جانا تھا۔ اور غالباً وہ اپنے میاں سے بھی ہر وقت یہی کہا کرتی تھی کہ کسی طرح واپس چلو۔ دراصل اس علاقے میں چوریاں بھی ہوتی رہتی تھیں جو کہ گھر کے ملازم ہی کرواتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور اس علاقے سے چور کا گرفتار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ نادرہ کے گھر ان ہی دنوں چوری ہو گئی تھی۔ اس واقعے نے اس کی بیزاری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

مجموعی طور پر چٹاگانگ بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ اس میں قدرتی مناظر کا ہر ممکن حسن موجود تھا۔ سرسبز پہاڑیاں، شاداب وادیاں اور بہت ہی خوبصورت

بڑی بڑی جھیلیں جن کے کناروں پر دور تک سبزہ خوابیدہ تھا اور پھر ساحل سمندر یوں لگتا جیسے قدرت نے اس جگہ پر حسن نہایت سخاوت سے نچھاور کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوئٹزر لینڈ کو قدرت نے حسن بھی دیا ہے اور انسانی ہاتھ کی صناعی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مگر جہاں تک بے صیقل و ناتراش قدرت کی صناعی کا تعلق ہے۔ چٹاگانگ خوبصورتی میں مجھے سوئٹزر لینڈ سے کسی طرح کم نہیں لگا۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے شوہر کے ہمراہ روزانہ سیر کو نکل جاتی۔ چاروں طرف سے قدرتی مناظر کی دلکشی اُمڈ اُمڈ کر جیسے استقبال کرنے لگتی۔ ہم لوگ ٹائیگر پاس کی پہاڑیوں کا چکر لگا کر سورج نکلے واپس آتے تو ہمیں تعجب ہوتا کہ اس قدر حسین گرد و پیش میں جب قدرت کی دلربا اپنے تمام غمزوں کے جام فراخدلی سے لنڈھا رہی ہے تو لوگ یہ جامِ سحری نوش کرنے کیوں نہیں نکلتے۔ سچ پوچھئے تو صبح کی فضا اتنی مسحور کن ہوتی کہ واپس آکر بھی دیر تک اس کا تاثر قائم رہتا۔

یوں تو چٹاگانگ کا قیام بہت پر لطف گزر رہا تھا۔ مگر ساڑھے تین سو روپے ماہوار تنخواہ سے جب ڈیڑھ سو روپے سرکٹ ہاؤس کا کرایہ نکل جاتا تو کھانے کے لئے کچھ نہ بچتا۔ ہر ماہ جمع شدہ پونجی سے کچھ نکال کر بھی معاشی حالت کمزور ہی رہی جب پاشا صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے ازراہِ ہمدردی ہم سب کے لئے کاکسز بازار کا دورہ رکھ دیا۔ اس طرح ایک تو سرکٹ ہاؤس کے بھاری کرایہ سے نجات مل رہی تھی اور دوسرے دورے کا مزید خرچ بھی ممکن الحصول تھا۔ لہٰذا ہم سب نے اس حکم کو نجات پذیر امدادِ غیبی پر مبنی کرتے ہوئے نئی منزل کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک غیر معمولی طور پر چمکدار صبح کو جب آفتاب کئی دنوں کے بعد بادلوں کی یلغار کو شکست دے کر پوری آب و تاب سے جلوہ فگن تھا۔ تابدار کرنوں نے پتوں پر

پڑی ہوئی بوندوں کو ہیرے جواہرات کی چمک بخش دی تھی کہ زیر تربیت افسران کا خاندان کاکسز بازار جانے کے لئے چاٹگانگ کی کالور گھاٹ پہنچا۔ گھاٹ کا منظر میرے لئے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ بہت سے بنگالی مرد، عورتیں اور بچے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ پر رونق گہما گہمی میں اجنبی سی صداؤں کا شور ہم سب کے لئے بہت دلچسپ تھا۔ ناظر صاحب یہاں بھی خضرِ راہ بنے ہوئے موجود تھے۔ جہاز میں ہمارے کیبن ریزرو کروا لئے گئے تھے۔ بلکہ ناظر صاحب کی مہربانی سے سامان ہمارے کمروں میں پہنچ چکا تھا۔ جلالؔ کے ہمراہ بیگم اور بچوں کے علاوہ دو بہنیں اور والدہ بھی جا رہی تھیں۔

کاکسز بازار کا سفر تو دلچسپ تھا۔ لیکن طویل ہونے کی وجہ سے کسی حد بور ہونے لگا۔ بالآخر لانچ کے عملہ کے ایک فرد نے آوازیں لگانا شروع کیں" شاڑے دوئی بام" پھر" دوئی بام" اور پھر" دوئی بام لاگے نا" ... ہر طرف گہما گہمی شروع ہوگئی۔ ہماری لانچ اب اُتھلے پانی میں جا رہی تھی اور آوازیں لگا لگا کر اور ناپ ناپ کر کوشش کی جا رہی تھی کہ لانچ ساحل کے جتنے قریب جا سکے پہنچائی جاتے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ خشکی میں" دھنس" جاتے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود کاکسز بازار سے کافی دور ہماری لانچ رک گئی۔ بڑی سی کشتی جسے سمپاں کہتے ہیں جہاز کے قریب آ لگی۔ لانچ سے اُتر کر ڈولتی ہوئی سمپان میں بیٹھنا جب کہ نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میں تو بے حد خوفزدہ ہوئی جا رہی تھی۔ مشرقؔ سمندر کے درمیان کے جزیرے کا رہنے والا شخص میرے ڈر پر متعجب تھا۔ شاہانہ ہنسے جا رہی تھی۔ ؎

ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی
سمندر ان کے، جہاز ان کے
اور میں بے چاری خشک وادیوں میں جنم جنم سے رہنے والی ......

کسی طرح سمپان پر سوار ہو کر جب ہم روانہ ہوئے تو ایک اونچی سی لہر آئی اور سمپان ایک زوردار ہچکولے کے ساتھ اس پر سوار ہو گئی۔ پھر مون سون میں بھری ہوئی خلیج بنگال کی پے درپے پہاڑ کی طرح اونچی لہریں جو آنے لگیں تو میں خوف کے مارے زرد ہو گئی اور کانپتی ہوئی آنکھیں بند کر کے آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ مشرف نے بتایا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر خود ایسی ہی سمپان چلاتا ہوا سندیپ سے آتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ان سمپان چلانے والوں کو اتنی مہارت ہوتی ہے کہ لہر کو دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ کتنی اونچی ہے اور ایک خاص زاویے سے سمپان کو اس پر چڑھا دیتے ہیں (عرصہ بعد ہم نے سنا کہ مشرف کے والد اور اس کا بھائی اسی طرح کی ایک سمپان کو چلاتے ہوئے خلیج بنگال کے ایک طوفان میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے)

خدا خدا کر کے سمپان رُکی اور ہم تھوڑی پایاب روی کے بعد ساحل کی نرم نرم ریت پر آ گئے، سامنے چند سو گز کے فاصلے پر جہاز کے نقشے کا بیحد خوبصورت سرکٹ ہاؤس اپنے دونوں بازو پھیلائے ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ ان دنوں کاکسز بازار کے پورے ساحل پر یہی واحد سرکٹ ہاؤس تھا۔ باقی تمام چھوٹی بڑی عمارتیں بعد میں بنیں۔

یہاں آ کر بہت ریلیف ملا۔ جلال تو اپنے ملازم ساتھ لایا تھا۔ سرکٹ ہاؤس کا باورچی ہمارے اور مشرف کے لئے مخصوص ہو گیا۔ چونکہ اور کوئی بھی مقیم نہ تھا۔ لہٰذا اپنے گھر کی طرح جو چاہتے پکواتے۔ اخراجات پر بھی کنٹرول ہو گیا اور ہم زندگی کی سب سے زیادہ پُرکشش اور حسین پکنک منانے لگے۔

علی الصبح ہم سمندر کے کنارے ہلکے ہلکے پانی میں چلتے ہوئے دور تک چلے جاتے جگہ جگہ جیلی فش پڑی ہوتیں۔ کہتے ہیں کہ یہ زندگی کی سب سے ابتدائی قسم ہے۔ فٹ

ڈیڑھ فٹ کے قطر کی بڑی سی جیلی کی طرح کی چیز جس میں نہ کوئی حرکت ہوتی اور نہ کوئی زندگی کے آثار ہوتے۔ رات کو سمندر کا مد جزر اسے کنارے کی ریت پر پھینک دیتا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی کیکڑوں کی فوجیں ان پر دھاوا بول دیتیں اور دس بجے تک جیلی فش کا نشان بھی نہ رہتا۔ وہ رازق بھی کس طرح سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ یوں لگتا جیسے کیکڑوں کی دعوت کا سامان انکا رازق خود سمندر سے نکال کر ان کو پہنچا دیتا ہے۔

ان دنوں کاکسز بازار کے ایس ڈی او (سب ڈویژنل آفیسر) حسن نواب صاحب تھے۔ یہ لکھنؤ کے مہاجر تھے۔ قابل اور سنجیدہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص اقدار کے مالک تھے۔ مثلاً شام کے وقت اپنے اردلی (جس کا نام جلال تھا) کو لے کر مخصوص وقت پر ساحل پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ ہاتھ میں ایک خاص چھڑی ہوتی اور اردلی ایک خاص فاصلے سے ان کے پیچھے چلتا۔ جب کبھی مڑ کر ایک خاص انداز سے بہ آوازِ بلند "جلال" پکارتے تو اپنے قاضی جلال صاحب چونک جاتے اور اس اتفاقیہ مماثلت پر اکثر جھنجھلا جاتے۔

دن میں یہ تینوں حضرات کام پر چلے جاتے۔ اکثر انہیں قریب کے جزیروں پر بھی جانا پڑتا اور اس تصوّر سے کہ سمپان پر یہ لوگ جاتے ہیں، میری تو روح فنا رہتی اکثر شام ڈھلے یہ لوگ لوٹتے تو جان میں جان آتی۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم سب خواتین ایک جگہ جمع ہو جاتیں۔ دن بھر گپ رہتی، چٹکلے چلتے، اکٹھے کھانا کھاتے، ہر پروگرام میں شاہانہ برابر کی شریک ہوتی، اردو نہ جاننے کے باوجود وہ خوب لطف اٹھاتیں۔ اور جب وہ دونوں بنگالی بولنے لگتیں تو مجھے بھی بُرا نہ لگتا۔ بلکہ میں بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی بنگالی شروع کر دیتی۔ زبان ہمارے تعلقات میں کبھی حائل نہ ہوئی۔ ان دونوں زبانوں سے میرے وطن کی مٹھاس ٹپکتی تھی اور مجھے تو دونوں

اپنی لگیتیں۔

دورے کی میعاد ایک ہفتہ تھی۔ لیکن ان تینوں نے پاشا صاحب سے درخواست کر کے اسے ایک ماہ کروالیا اور ہم کافی عرصے تک ساحلِ سمندر کا مزہ لوٹتے رہے ہم سب مل کر بدھ مت کے چیانگ (عبادت گاہیں) دیکھنے گئے۔ داستانیں سنی تھیں کہ یہاں سکون قلب بہت ملتا ہے۔ مجھے تو سخت افسردہ کن ماحول لگا۔ ہر سمت ہُو کا عالم، کہیں کہیں چھپر سے ڈال کر پنڈال بنائے ہوئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ ریسیٹ ہاؤس ہیں۔ ان کے اندر مرد دیواروں کا سہارا لئے ہوئے نڈھال پڑے ہوئے تھے جیسے کسی نشے کے زیرِ اثر ہوں۔ کچھ عورتیں لمبے چغے سے پہنے کپڑا سینے پر کس کر باندھے ہُوئے بڑے بڑے ہاون دستوں میں غالباً دھان کوٹ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر عجیب طرح کی اداسی اور یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ چیانگ کی اصل عمارت پر جاکر راہب ملے اور ہمیں بتایا کہ عبادت گاہ کے اندر کوئی عورت داخل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ عورت کو نجس سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر عورتیں عبادت کرنا چاہیں تو عبادت گاہ کے دروازے کے باہر سے کر سکتی ہیں۔ گو انہوں نے ہم تینوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن ہم ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے باہر ہی رہیں۔

چیانگ سے ذرا دور ہٹ کر ایک صنعتی ادارہ ہے۔ ادارہ کے مالک مسٹر یوچن نے ہمیں اپنے گھر مدعو کیا۔ دونوں میاں بیوی بڑے تپاک سے ملے۔ پگوڈا کی طرز کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر بہت صفائی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مسز چن سے بات چیت کر کے اندازہ ہوا کہ ان کے سارے اقدار مشرق بعید کی بُدھ تہذیب کے قریب ہیں۔ نسوانی حسن کا معیار ایک خمدار پتلا جسم سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے بچپن سے ہی لڑکیوں کی چھاتی پر کپڑا کس کر باندھ دیا جاتا ہے — ان کا کھانا پکانا،

اوڑھنا، بچھونا اور کھیلنا کودنا بالکل مختلف تھا۔ ان لوگوں کو عام زبان میں مگھ کہا جاتا۔ اور میں نے ایک ماہ کے قیام کے دوران کبھی ایک مگھ بچے کو کسی غیر مگھ بچے سے کھیلتے نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کے خیال میں عورت ایک گھٹیا جنس ہے اور اس کا کام مرد کو آرام اور عیش فراہم کرنا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں میں عورتیں کام کرتی ہیں اور مرد ریسٹ ہاؤس میں آرام کرتے ہیں۔

مسٹر یوچن کے گھر کے قریب ہی ایک سگار اور چرٹ بنانے کا کارخانہ تھا جو کہ بہت چھوٹا سا تھا۔ کارخانے میں کام کرنے والی تقریباً ساری عورتیں ہی تھیں۔ کچھ دور مچھلی کو خشک کرنے کا کام ہوتا تھا۔ خشک مچھلی "شٹکی ماچھ" کہلاتی ہے اور ایک نفیس غذا سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس کے لئے مخصوص ذائقے اور "خوشبو" برداشت کرنے کے لئے خاص ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ عام حالات میں تو دیکھتے ہی دل متلانے لگتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ عادی ہونے کے بعد یہ لذیذ ترین غذاؤں میں سے ایک ہے۔

تین روز کے لئے پاشا صاحب بھی اپنی بیگم کے ساتھ کاکسز بازار تشریف لائے تو ہم سب کی عید ہو گئی۔ پاشا صاحب نے حکم صادر کر دیا کہ کسی کا الگ کھانا نہیں بنے گا بلکہ ہم سب ان کے مہمان ہوں گے۔ صبح شام ایک تقریب کا سا سماں رہنے لگا۔ حسن نواب صاحب، حکیم صاحب (جو وہاں سب ڈویژنل پولیس آفیسر تھے) اور مسز ثریا حکیم بھی وہاں اکثر آجاتے۔ یہ دونوں میاں بیوی بنگالی تھے۔ ثریا کسی مضمون میں ایم اے تھی اور اکثر انگریزی بولتی جو مسز جلال کو ہمیشہ کھلتی اور جب ثریا کی انگریزی کا جواب پاشا صاحب صاف صاف بنگالی میں دیتے تو مسز جلال کو دلی مسرت ہوتی اور وہ ثریا کو انگریز کی دُم کہتی...... اور اس واقعے کو بعد میں بھی ضرور دہراتی۔

کاکسز بازار کا ایک واقعہ اب بھی یاد آتا ہے تو ندامت کے باعث جسم کے اندر خفیف سا لرزہ ہونے لگتا ہے۔ ہوا یوں کہ گرلز ہائی سکول کا سالانہ ڈرامہ تھا۔ تین انعامات رکھے گئے تھے جو بہترین کرداروں کو دیئے جانے تھے۔ مجھے اس تقریب کا چیف گیسٹ بنا دیا گیا۔ منصفی کا کام بھی مجھے ہی کرنا تھا۔ ڈرامہ ہوا، مجھے کچھ نہ پتہ چلا کہ کیا کہا گیا اور کیا موضوع تھا۔ گانے گائے گئے، یقیناً اچھے ہوں گے۔ مگر نہ سمجھنے کے باعث میں قدرشناس نہ بن سکی۔ البتہ ایک ننھی سی لڑکی نے ناچ کیا اور میں محوِ حیرت بنی اسے دیکھتی رہی۔ میرے ذہن میں اپنے لاہور کالج کا زمانہ آ گیا جب ایک معمولی سی لُڈّی کی چند چٹکیاں اور تالیاں بجانے کی پریکٹس مہینوں کروائی جاتی تو کہیں جا کر لُڈّی ترتیب پاتی اور وہ بچی تو باقاعدہ کلاسیکل ناچ کر رہی تھی۔ جب میں نے پہلا انعام اسے دینے کا فیصلہ کیا تو بوڑھے ہندو ہیڈ ماسٹر نے بہت تعجب کا اظہار کیا۔ میں نے ناچ کی تعریف میں مزید کلمے ادا کئے تو وہ خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ مگر ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ تو ناچ کے ابتدائی توڑے تھے جو تقریباً ہر ہندو لڑکی جانتی تھی۔ اس لڑکی میں اوّل انعام حاصل کرنے والی کوئی خصوصیت نہ تھی اور مجھے اس معمر استاد کی نظریں یاد کر کے خود بخود شرمندگی ہونے لگی۔ دو تہذیبوں کا فاصلہ آخر کہیں نہ کہیں سے جھانک لیتا ہے۔

ایک روز خبر ملی کہ ایس ڈی او صاحب کو کسی نے رائیل بنگال ٹائیگر کے دو بچے تحفتاً دیئے ہیں (مغربی اور مشرقی پاکستان میں تحفے کی نوعیت کا اختلاف دیکھئے) ہم لوگ لپکے ہوئے اس عجیب و غریب تحفہ کو دیکھنے گئے۔ ایک لکڑی کے کریٹ میں دونوں دو تین روز کی عمر کے شیر سوئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے قریب ہو گئے۔ بڑی بلی کے سائز کے بچے جب اُٹھے اور منہ کو گھما کر دھاڑے تو اتنے سے بچوں نے دل

دہلا دیا۔ حسن نواب صاحب چونکہ مجرّد تھے۔ لہٰذا جب شرارت میں ان سے پوچھا جاتا کہ "آپ کے بچوں کا کیا حال ہے؟" تو بہت جھنجلاتے۔ بعد میں پتہ لگا کہ انہوں نے یہ تحفہ چڑیا گھر کو دے دیا۔

کاکسز بازار سے واپس چٹاگانگ آئے تو ان لوگوں کی ضلعی تربیت تقریباً مکمل ہو چکی تھی لہٰذا ڈھاکہ واپس پہنچے۔ تمام افسروں نے اس کے بعد ولایت مزید تربیت کے لئے جانا تھا۔ لہٰذا رمنا ریسٹ ہاؤس میں ولایت جانے کے پروگرام ہی گفتگو کا موضوع بنے رہتے۔ ایک مسئلہ تمام الجھنوں کے ساتھ ہر وقت میرے ذہن پر مسلّط رہتا۔ میرے شوہر اپنے خرچ پر مجھے ولایت ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لہٰذا چند انتظامات کرنے کے لئے مجھے جلد مغربی پاکستان آنا پڑا۔ اور اس طرح مشرقی پاکستان کا بہت پُر لطف اور طالع آزما دور اختتام پذیر ہوا۔ گو اس مختصر مدت میں وہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات کا صحیح جائزہ تو نہ لیا جا سکا۔ مگر ایک خاکہ سا دماغ میں آگیا۔ ہمارے پاس بغیر کسی تلخی کے اپنے وطن کے اس دور افتادہ خطّہ کی حسین یادیں تھیں۔

ولایت سے واپس آکر تربیّت مکمل ہو چکی تھی اور سب افسروں کو فرائضِ منصبی ادا کرنے کے لئے مختلف مقامات پر تعیّنات کیا جا رہا تھا۔ سابقہ دستور کے مطابق تین افسروں کو مشرقی پاکستان متعین ہونا تھا۔ ان دنوں مرکزی ملازمتوں کی شرائط میں ایک لازمی شرط یہ تھی کہ ہر افسر کو ملک کے دونوں حصوں میں کم ازکم پانچ سال ملازمت کرنا ضروری تھا — جن تین افسروں کو مشرقی پاکستان بھیجا جا رہا تھا۔ ان میں میرے شوہر بھی شامل تھے۔ ابھی تک دوسرے بازو کا تبادلہ سزا نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اچھے افسروں کو ہی دوسرے بازو میں جانے کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔

ہم لوگ بھی جب مشرقی پاکستان کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے تو

ذہن میں یہی اطمینان تھا کہ پانچ سال کی ملازمت تو وہاں لازمی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ابتدائی عرصہ وہاں گزار لیا جائے۔ کیوں کہ وطن عزیز کے حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کے غیر ملک کے علاقہ نے آمد و رفت کو مشکل اور قیمتی بنا دیا تھا اور ملازم پیشہ افراد کے لیے اپنے پلّے سے یہ سفر خرچ ناقابل برداشت تھا۔ بس یہی ایک کانٹا تھا جو بے چین کر دیتا تھا۔ میرے شوہر کو چٹا گانگ ہی جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ اگلی پوسٹنگ کے احکامات وہاں سے ملنے تھے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

۱۹۵۶ء میں ستمبر کے آخری ایام تھے جب ہم چٹاگانگ پہنچے۔ بنگال کا یہ بہترین موسم ہوتا ہے۔ نیلا آسمان بالکل صاف و شفاف تھا۔ ناظر صاحب حسب سابق ٹرین پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ اسی طرح ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ اس دفعہ اوپر کی منزل پر بائیں بازو کا پہلا شاندار کمرہ ملا۔ چونکہ اب گھر بنا کر رہنا تھا اس لئے ایک تیرہ چودہ برس کا ملازم لڑکا اپنے ہمراہ لے کر گئے۔ چونکہ سرکٹ ہاؤس کے انچارج رضا تھے۔ لہٰذا ملازم اچھی خاصی اہمیت دیتے تھے اور ڈھنگ سے ہر کام کر دیتے تھے۔ اب میرے شوہر زیر تربیت افسر نہ تھے۔ بلکہ باضابطہ طور پر اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ مگر وہ پہلے والی زندگی میسر نہ تھی۔ عبدالرشید صاحب ڈپٹی کمشنر اور ایس اے ایم خان صاحب کمشنر تھے۔ مسز رشید عمدہ خاتون تھیں۔ انہیں سوشل ورک کرنے کا بہت شوق

تھا۔ اپوا کی خواتین سے غالباً ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ اس لئے انہوں نے اپنی علیحدہ خواتین کی سوشل ورک کی تنظیم بنائی جو کہ بہت سرگرم عمل دکھائی دیتی تھی۔

ان دنوں بیگم رشید کے یہاں تغذیۂ خوراک پر سلسلہ وار لیکچرز ہو رہے تھے۔ یہ لیکچرز ایک امریکن خاتون دے رہی تھی جو عرصۂ دراز سے بنگال میں مقیم تھیں۔ پروگرام محض تفریحی اور معلوماتی نہ تھا۔ بلکہ باقاعدگی سے جماعت لگتی۔ جس میں اسکول کی ٹیچرس اور جونیئر افسروں کی بیویاں شامل ہوتیں۔ ہم سب کاغذ پنسل لے کر نوٹس لیتیں۔ لیکچر کے دوران بیگم رشید سوالات بھی پوچھ لیتیں اور ہم لوگ جو زمانۂ طالب علمی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں خوب تلملاتیں۔ بیگم رشید بہت اچھی بیوی، ذمہ دار ماں اور بہت ہی جوشیلی سوشل ورکر تھیں مگر وہ بہت باضابطہ قسم کی شخصیت تھیں۔ اپنے تمام کاموں کی کاملیت کا انہیں یقین ہوتا اور کسی کی دخل اندازی اور اعتراض تو سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس دفعہ ماحول زیادہ خوشگوار نہ ملا اور جب رضا نے چندر گونا، رنگامتی اور گیتائی کا دورہ بنایا تو مجھے بے حد تسکین ہوئی۔ ان تمام مقامات پر بذریعہ جیپ بھی جایا جا سکتا تھا اور دریائے کرنافلی کے ذریعے لانچ پر بھی۔ رشید صاحب نے ہمیں لانچ لے جانے کی اجازت دے دی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ واپسی پر جیپ استعمال کی جائے۔ تاکہ دونوں سواریوں سے اس علاقہ کو دیکھا جا سکے۔

یہ سفر میں کبھی نہ بھولوں گی۔ لانچ ایک مکمل گھر تھا۔ کمرۂ طعام بمع کٹلری اور کراکری کے۔ سونے کا کمرہ ایک خوبصورت کیبن نما تھا۔ جس میں دو چارپائیاں کمرہ کی ساخت کے ساتھ ہی بنا دی گئی تھیں۔ ہلکی سی چارپائی درمیان میں بچھائی جا سکتی تھی۔ باہر بیٹھنے کے لئے ڈیک پر آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لانچ کا عملہ چوکس و ہوشیار تھا اور باورچی بہت عمدہ، منٹوں میں ہر قسم کا کھانا تیار کر لیتا اور پھر ہم خود پوری

لانچ کے مختار اور مالک، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بیٹھ کر قدرت کی دل کشی کا نظارہ کیجئے یا کیبن میں لیٹ کر کھڑکی سے سحر آفریں گرد و پیش کو دیکھتے دیکھتے خوابوں کی دنیا میں چلے جائیے، کوئی روک ٹوک نہیں۔ ؎

ہیں تیرے تصرف میں، یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں

دریائے کرنافلی کے چاروں طرف بانس اور دوسرے درختوں کے گھنے جنگل ہیں۔ ان ہی درختوں کے گودے سے کرنافلی پیپر مل میں کاغذ تیار ہوتا ہے اور اس جنگل میں کثرت سے جنگلی جانور اور بالخصوص ہاتھی پائے جاتے ہیں۔ بلند منصب معزز غیر ملکیوں کو اس جنگل میں ہاتھی کا شکار کھلایا جاتا تھا۔ دریا میں جابجا بڑی بڑی کشتیوں میں مچھلی پکڑنے کے جال لگے ہوئے تھے، بہت بڑے بڑے جال۔ کہیں کہیں اکّا دکّا چھوٹی کشتی میں چھوٹے جال سے بھی کوئی مچھلی پکڑتا نظر آجاتا۔ کنارے پر کہیں کہیں ذرا بلندی پر درختوں میں گھرے ہوئے مختصر سے گاؤں بھی دکھائی دیتے۔ رنگ برنگی دھوتیوں میں ملبوس گاؤں کی لڑکیاں مچھلی پکڑنے کی ایک خاص قسم کی ٹوکری دریا میں لٹکا جاتیں اور تھوڑی دیر کے بعد بھاگتی ہوئی اسے دیکھنے آتیں اور جو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ٹوکری میں پھنس گئی ہوتیں انہیں نکال کر دوبارہ ٹوکری وہیں لٹکا جاتیں۔ وہ دبلی پتلی، سانولی سلونی سرخ سبز رنگ میں ملبوس بھاگتی ہوئی لڑکیاں اس رومانی ماحول کا شاعرانہ عنصر بن جاتیں۔ اتنا حسین ماحول اور اس قدر آرام دہ سفر تھا کہ پتہ بھی نہ چلا اور ہم لوگ چندر گونا پہنچ گئے۔

چندر گونا میں ہم پیپر مل کے مہمان تھے۔ اتنے بڑے صنعتی ادارے کا مہمان بننا نہ صرف ایک اعزاز ہے بلکہ ایک ایسی عیاشی جو انسان کو شاذ و نادر ہی میسّر آتی ہے چندر گونا کا سرکٹ ہاؤس بہت ہی خوبصورت پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ اور ارد گرد

کی پہاڑیوں پر اسی طرح کے نہایت نفیس اور شاندار بنگلے مل کی انتظامیہ کے لیئے تھے۔ ایک تو سرکٹ ہاؤس کی جدید تعمیر اور پھر دورِ جدید کی ہر سہولت موجود۔ ہر چیز کا ایسا شاندار اہتمام کہ مجھے اپنی زندگی کے اس ایک روز پر رشک آنے لگا۔

دوسرے دن ہمیں مل دکھلائی گئی۔ اتنی بڑی صنعت دیکھنے کا میرا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے ہر چیز بہت ہی دلچسپ لگ رہی تھی۔ کارخانے کا ایک افسر ہمیں کاغذسازی کا پورا طریقِ عمل دکھاتا اور سمجھاتا رہا۔ حالانکہ ہمیں ایک مغربی پاکستان کے افسر نے بتایا کہ یہاں ابھی چند سال پہلے مغربی پاکستان کے ایک افسر بالا جن کا نام خورشید علی تھا قتل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اس خبر کے باوجود اور مشینوں کے بے انتہا شور کے درمیان بھی کس قدر امن وامان اور سلامتی کا احساس تھا۔ ہر فرد و بشر اپنا سا لگ رہا تھا۔ ان کے چہروں پر نفرت اور مخالفت کا تو سایہ بھی نہ تھا۔ سب کی سادہ سی شخصیتوں میں سے اخوّت اور محبّت ہی کی کرن ہویدا تھی۔ تعصّب کا عفریت تو کہیں سے بھی نہ جھانک سکتا تھا۔ اس خوشگوار ماحول میں فضا کی لطیف اٹھکیلیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کوئی انتہائی قنوطانہ فطرت کا انسان بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ ٹھیک چودہ برس کے بعد اس حسین ماحول میں خون کی ایسی ہولی کھیلی جائے گی، کہ چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ نفرت اور تعصّب کا عفریت اس طرح ناچے گا کہ انسانیت کی ہر قدر سرنگوں ہو جائے گی۔

میں بھی کدھر بھٹک گئی۔ ابھی تو میں چندر گونا کے افسانوی ماحول کا ذکر کر رہی تھی۔ دوسرے روز ہم لوگ پھر اپنی لانچ پر دریائے کرنافلی کے بہاؤ کے مخالف، گرد و پیش کے لے انتہا حسن میں ڈوبے ہوئے کپتائی اور رنگامتی کی طرف جا رہے تھے ہماری آخری منزل رنگامتی تھی۔ شام کے چار بجے ہوں گے جب ہم رنگامتی کے سرکٹ ہاؤس میں پہنچے۔

رنگامتی کے ڈپٹی کمشنر کرنل نبلٹ انگریز تھے۔ انہیں ہم لوگوں نے اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر وہ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم لوگ بالکل بے سہارا یتیموں کی طرح سرکٹ ہاؤس میں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چائے کی پیالی پی کر تازہ دم ہوئے تو ہال میں جاکر بیٹھنے کا خیال آیا۔ مغربی پاکستان سے ایک چیف انجینئر اور چند افسران بالا تشریف لائے ہوئے تھے اور محو گفتگو تھے۔ ہم لوگ نہایت سعادت مندی سے ان کے پاس گئے، مگر مغربی پاکستان کے افسران بالا کے یہاں جونیئر افسروں کو گھاس ڈالنے کی روایت شاید کبھی نہیں تھی۔ انہوں نے ایسی حقارت سے ہمیں دیکھا جیسے ان کی خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ "اپنا مقام پہچانو! تمہیں ہم لوگوں سے بے تکلف ہونے کی جرأت ہی کیسے ہوئی۔" اپنا سامنہ بنا کر ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے اور احمقانہ طور پر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا کہ ایک جیپ باہر آکر رکی اور سرکٹ ہاؤس کے ملازمین عجلت میں اس کی طرف بڑھے۔ ایک طویل قامت انگریز معمولی سی قمیض و پتلون میں ملبوس لپکتا ہوا ہال میں داخل ہوا اور میرے شوہر کا نام لیا۔ وہاں موجود باقی معزز حضرات سے رسمی مصافحہ کرتا ہوا ہماری طرف اس طرح لپکا جیسے کوئی اپنا عزیز ہو اور میرے شوہر کو گلے لگا لیا۔ ایک بزرگ والی شفیق ڈانٹ پلائی کہ آنے کی اطلاع بہت دیر سے کیوں دی۔ ان کے بقول جس وقت انہیں اطلاع ملی وہ اُسی وقت دورہ چھوڑ کر سیدھے رنگامتی آئے مگر پھر بھی دیر لگ ہی گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے پہنچنے سے پیشتر وہ موجود ہوتے۔ لیکن فاصلے کی طوالت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس وجہ سے معذرت کرکے ہمیں بار بار شرمندہ کر رہے تھے۔ ہال کا پژمردہ ماحول یک دم چمک اٹھا۔ دوسرے معزز حضرات کی یخ بستہ اجنبیت میں بھی دوستی کی حرارت سرایت کر گئی اور کرنل نبلٹ اسی وقت ہمیں ساتھ لے کر

اپنی رہائش گاہ پر آ گئے۔

مسز نبلٹ ہماری منتظر تھیں۔ نبلٹ صاحب چونکہ سیدھے ہماری طرف چلے گئے تھے۔ لہٰذا اجازت لے کر منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسلخانے میں چلے گئے اور ان کی بیگم چائے کی میز پر مختلف النوع موضوعات پر گفتگو کرنے لگیں۔ اُس بنگلہ کی ہر چیز کے ساتھ داستان منسلک تھی۔ ایک بڑی سی مہاگنی کی چمکتی ہوئی میز پر اس وقت تک کے تمام ڈپٹی کمشنروں کے نام کھدے ہوئے تھے۔ پاکستان بننے سے قبل بھی کرنل نبلٹ یہاں کے ڈپٹی کمشنر تھے اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے مستقل طور پر اس علاقہ کے ڈپٹی کمشنر رہے تھے۔ لہٰذا ان کے پاس سنانے کے لئے اتنا بہت سا اور دلچسپ مواد تھا کہ ہم ہمہ تن گوش بنے وہ سب کچھ سنتے رہے۔

اس علاقہ میں کوبرا سانپ بہت تھے۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ سانپ، سانپ کو کھا جاتا ہے۔ مسز نبلٹ نے بتایا کہ "چند روز ہوئے ملازموں نے اطلاع دی کہ ایک نو فٹ کا کوبرا ایک چھ فٹ کے کوبرا کو کھا رہا ہے۔ فوراً میں نے سپاہی کو بندوق دے کر اسے مارنے بھیجا۔ جا کر دیکھا کہ ایک بہت بڑے درخت کے پاس اتنا بڑا سانپ جو دوسرے سانپ کو آدھا کھا چکا تھا پڑا تھا۔ ان حالات میں میں نے یہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ لہٰذا دوسرے روز جب نبلٹ دورے سے واپس آئے تو میں نے ملازموں سے سانپ لا کر دکھانے کے لئے کہا۔ مگر معلوم ہوا کہ ملازم سانپ کو کھا چکے ہیں۔" لیجئے پہلی مرتبہ سانپ کھانے والوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ تفصیلات معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اگر سانپ کے سر کو اتار دیا جائے تو باقی جسم ایک لذیذ مچھلی کی طرح ہوتا ہے... ان حضرت انسان نے جب کرۂ ارض کی ہر چیز کو ہڑپ کیا تو بھلا سانپ کیوں بچا رہتا۔

اس تمام علاقے کو چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کہتے ہیں۔ پہاڑیوں کا یہ سلسلہ کس طرح پاکستان میں شامل ہوا۔ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے جو محیر العقول لگتی ہے۔ مگر

کرنل نبلٹ اس کے عینی گواہ تھے - قدرت کے کھیل نرالے ہیں :

اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝

اس قادرِ مطلق کی شان تو یہی ہے کہ جس کام کو کرنے کا ارادہ کرے اسے کُن کہے اور وہ ہو جائے۔

کرنل نبلٹ کا کہنا ہے کہ تقسیم سے قبل اس علاقہ میں کانگرسی کارکن بہت مستعدی سے سرگرم عمل تھے ۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ یہ تمام علاقہ بھارت میں شامل ہو جائے گا ہل ٹریکٹ کا تین چوتھائی حصہ پاکستان میں آ گیا۔ اس فیصلہ پر کانگرسی کارکن بہت مشتعل ہوتے۔ وہ کسی قیمت پر یہ حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ چودہ، پندرہ اگست کی درمیانی رات کو انہوں نے اپنی عمارت پر ترنگا جھنڈا لہرایا۔ مگر اسی رات ایک ایسا مافوق الفطرت واقعہ پیش آیا۔ جس نے ان کے حوصلے پست کر دیئے، اور اسے قوت غیبی کا فیصلہ جان کر وہ بھارت چلے گئے۔ ہوا یوں کہ دریائے کرنافلی کے عین کنارے خاصی اونچائی پر ایک مندر کی عمارت تھی۔ اس شب نہ جانے کیا ہوا کہ پندرہ اگست کی صبح کو مندر والی جگہ بالکل صاف پڑی دیکھی گئی۔ جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ پوری عمارت اس طرح دریا میں جا گری تھی کہ اس کی ایک اینٹ بھی باقی نہ تھی۔ ارد گرد کسی اور چیز کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ صرف مندر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ جیسے اللہ دین کا چراغ پوری عمارت کو کہیں لے گیا ہو۔ اس واقعہ کی وضاحت عقل نہیں کر سکتی۔ مگر یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کی گواہ پوری آبادی ہے۔ اس واقعہ نے کانگرسی کارکنوں کی کمر توڑ دی . . . . . پاکستان واقعی مملکت خداداد ہے۔ مشیتِ ایزدی سے ہی وطن عزیز وجود میں آیا۔ ایسے ہی واقعات اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

اس علاقہ کے لوگوں کا کوئی مذہب نہ تھا۔ نہ وہ مسلمان تھے، نہ ہندو، اور نہ

ہی بدھ ۔ مذہب کے معاملے میں ابھی تک وہ بالکل ناپختہ الذہن تھے۔ جیسے صدیوں پہلے انسان جس چیز سے خوف کھاتا اسی کی پرستش شروع کر دیتا ۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اسی چیز کو دیوتا سمجھنے لگتے جس کو ناقابل تسخیر سمجھتے ۔ مذہب کا واضح تصوّر ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ کرنل نیلٹ ان حالات میں اس خوبصورتی سے اس علاقے میں عیسائیت کا مشن چلا رہے تھے جس کی کامل اور حتمی کامیابی میں کوئی خامی نہ تھی ۔ وہ اس طرح سے مقامی لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے چلے جا رہے تھے کہ بستیاں کی بستیاں نہایت سہل اور خوشگوار طریقے سے عیسائی ہوتی جا رہی تھیں ۔ لوگوں کے اذہان کی صاف سلیٹ وہاں موجود تھی ۔ اس پر وہ انگریز ایسی محبت بھری چابکدستی سے عیسائیت کی تعلیم کندہ کر رہا تھا کہ یہ تحریر مقامی لوگوں کے دلوں پر انجانے طور پر نقش ہوتی چلی جا رہی تھی ۔ یہ لوگ انتظامیہ کے کاروبار کی آڑ میں جس لگن سے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے ۔ اس کا جواب اپنے ہاں شاید بالکل ہی مفقود ہو چکا تھا ۔ حالانکہ روحِ تبلیغ تو اسلام میں تھی جو اغیار نے لے لی ۔ مگر یہ تو ایک ایسا المیہ ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر مسلط ہو چکا ہے اس پر ؏

روئیے بار بار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

کافی اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن کرنل نیلٹ مصر تھے کہ وہ ہمیں اپنا علاقہ دکھلائیں گے باہر نکلنے سے پیشتر بیوی سے وہ یہ نہ پوچھنا بھولے کہ امریکن پرانے کپڑے بانٹ دیئے گئے ہیں یا نہیں ۔ امریکہ سے بھیجے گئے پرانے کپڑے ، گندم ، دودھ اور گھی ایک مفلوک الحال قوم کے اعتقادات خریدنے کے لئے کافی عرصے تک استعمال ہوتے رہے ہیں ۔

جب ہماری جیپ آبادی سے نکل کر مکمل اندھیرے میں آئی تو خوف کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا ۔ گھپ اندھیرا ، کچی اور پتھریلی زمین کی ناہموار سطح ، جیپ

کے دونوں جانب اونچے اونچے گھنے بانس کے جنگل اوپر سے جنگلی جانوروں کی ہیبت ناک آوازیں، یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج زندہ واپس جانا نہ ملے گا۔

جیپ میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر میں اور میرے شوہر بیٹھے تھے اور پیچھے کی سیٹ پر کرنل نبلٹ جو مستقل طور پر ہمارے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ بار بار کہتے "گھبرائیے نہیں، میرا ڈرائیور یہاں کی زمین کے ہر انچ سے واقف ہے۔ اندھیرے میں اکثر ہم لوگ اس علاقے میں نکلتے ہیں آپ بالکل محفوظ ہیں۔" یوں لگتا کہ فلک کی رفعتوں سے ستارہ اپنا پیغام سنا رہا ہو۔ کہ ؎

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
میری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

مگر ہم ایسے مسافر تھے جو اس تاریکی سے خوف زدہ ہی رہے۔ کرنل نبلٹ کی تسلیوں کے باوجود ہمارے اندر حفاظت کا احساس دور دور تک نہ تھا۔ ایک جگہ کئی دھچکوں کے بعد جیپ رکی۔ نبلٹ بولے "یہ میدان میں نے فٹ بال کے لئے ہموار کرایا ہے"۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا، مجھے تو کچھ نظر نہ آیا۔ جیپ پھر چل پڑی۔ چند کچے گھروندے سے نظر آئے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی انسان تو نظر پڑا۔ ایک ایسے ہی کچے گھر کے سامنے جیپ رکی۔ ایک لڑکا ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے باہر نکلا۔ کرنل نبلٹ اس سے ایسے ملے جیسے کوئی اپنا بیٹا یا عزیز ہو۔ ہم سے تعارف کروایا۔ گھر کے سب لوگوں کی فرداً فرداً خیریت پوچھی۔ وہ لڑکا مصر تھا کہ ہم اس کے گھر رکیں مگر پھر آنے کا وعدہ کر کے کرنل نبلٹ روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی جگہ ایسی ہی آبادی کے ایسے ہی گھروں کے سامنے رُکے۔ مردوں سے

بھی ملے اور عورتوں سے بھی۔ کسی کو بھابھی اور کسی کو بیٹی کہتے ہوئے اس طرح خیریت دریافت کی جیسے سگے رشتہ دار ہوں اور میں سوچتی رہی کہ دلوں پر حکومت کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ دوسرے انگریز حاکموں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر کرنل نبلٹ کی حاکمیت میں جو ادائے دلبری دیکھی اسے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ان لوگوں کے یہی اطوار تھے کہ سلطنت برطانیہ میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

راستے میں ہر علاقے کی خاصیت وہ تفصیل کے ساتھ بتا رہے تھے مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرے جنگل کے انجانے خوف نے میری ہر حس منجمد کر رکھی تھی۔ اور میں مستقل آیۃ الکرسی کا وِرد کرتی جا رہی تھی کہ خدا خدا کر کے نبلٹ نے ڈرائیور کو واپسی کا حکم دے دیا۔ کوئی بارہ ایک بجے کے قریب ہم لوگ سرکٹ ہاؤس پہنچے، بس جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اس مہم جوئی کو سات سلام جو سارا خون ہی خشک کر دے۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے پر ہم لوگ نبلٹ صاحب کے گھر مدعو تھے۔ کسی طور وہ میاں بیوی ہمیں پسند کرنے لگ گئے اور مصر تھے کہ رضا چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کی سب ڈویژن بندربن کے ایس ڈی او بننا قبول کر لیں۔ مسز نبلٹ بندربن کی خصوصیات میں اس مَد کا بھی اضافہ کر رہی تھیں کہ بندربن کے ایس ڈی او کو نوّے روپے تنخواہ بھی زیادہ ملتی ہے۔ نیز ہفتہ میں ایک دو روز ہم لوگ ان کے ساتھ بھی گزار سکتے ہیں مگر اس بات کا کیا کیجیے کہ بندربن کی صفات میں پہلے ہی سن چکی تھی کہ ایس ڈی او کا گھر اونچی اونچی بلیوں پر بنا ہوا ہے اور رات کو گھر کے نیچے شیر چہل قدمی کرتے ہیں لہٰذا مجھے نوّے روپے تو کیا نوّے ہزار بھی وہاں خوشی سے جانے پر رضامند نہ کر سکتے تھے۔ نبلٹ، رضا کو کہہ رہے تھے کہ "اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں تمہارے آرڈر ایک دن میں منگوا سکتا ہوں۔" انکا گورنمنٹ میں کافی اثر تھا۔ پاکستان کے صدر سکندر مرزا صاحب سے انکی ذاتی دوستی تھی بلکہ اسکندر مرزا نبلٹ کو چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کا بے تاج

بادشاہ کہا کرتے تھے۔

واقعی وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ دس بارہ سال سے وہاں بغیر کسی مداخلت کے حکومت کر رہا تھا۔ کئی قبیلے اسے دیوتا مانتے اور اس کی پرستش کرتے تھے وہ بھی ان کے ناپختہ ذہنوں کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ نبلٹ نے خود بتایا کہ ایک مرتبہ وہ جیپ میں جا رہے تھے کہ جیپ الٹ گئی اور وہ جیپ کے نیچے آکر بے ہوش ہو گئے جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ ایک چارپائی پر پڑے ہیں اور مقامی لوگ ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ان کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ جب انہیں اپنی زندگی کا یقین آیا تو انگریز کی بیدار مغزی ان سادہ لوح انسانوں کے ساتھ ایک خوبصورت چال چلنے پر ایک دم آمادہ ہو گئی۔ نبلٹ چارپائی پر بیٹھ گئے اور یوں گویا ہوئے "اے احمق لوگو! کیا تم اس طرح اس لئے کھڑے ہو کہ تمہارا خیال ہے کہ میں مر چکا ہوں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں تمہارا دیوتا ہوں۔ دیوتا تکلیف سہہ سکتا ہے مگر مر نہیں سکتا۔" وہ بے انتہا سادہ لوح لوگ سیدھے احتراماً کھڑے ہوئے اور پھر ندامت میں احتراماً سر کو اور جھکا لیا (آج کے تہذیب یافتہ دور میں ہم سوچ نہیں سکتے کہ ہمارے ہی ملک کے دور افتادہ علاقوں میں اب بھی ہمارے بھائی انسانی ذہن کی ان ابتدائی منازل میں بھٹک رہے ہیں)۔ یہ ایک ایسا ہی قبیلہ تھا۔ قبیلہ کا سردار فوراً قریب آیا اور اپنے جسم سے خون نکال کر نبلٹ کے ماتھے پر تلک لگایا۔ یعنی دونوں بھائی بن گئے۔ اور باقاعدہ اس خوشی میں جشن منایا گیا۔ قبیلہ کا سردار تو دیوتا سمجھا ہی جاتا تھا نبلٹ بھی اس استحقاق میں برابر کا شریک بنا رہا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد جلدی جلدی ہم لوگوں نے سامان جیپ میں رکھوایا اور نبلٹ کے گھر خدا حافظ کہتے چلے۔ نبلٹ کا پروگرام بھی ہمارے ساتھ چٹاگانگ چلنے کا تھا۔ مگر علی الصبح ہی انہیں کہیں سے اطلاع ملی تھی کہ کسی کو سانپ نے ڈس

لیا ہے اور وہ سانپ کے زہر کے تریاق کا ٹیکہ لے کر وہاں خود جانا چاہتے تھے. لہٰذا انہوں نے ہمارے ساتھ چلنے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ ان کے بقول انسانی زندگی اس پروگرام سے زیادہ اہم ہے۔

ان کے گھر کے احاطہ میں ان کا ہاتھی لال بہادر جھوم رہا تھا۔ نبلٹ میرے بچے پپچو کی انگلی پکڑ کر ہاتھی کے پاس لے گئے۔ اور لال بہادر نے سونڈ اٹھا کر میرے بچے کو سلام کیا۔ نبلٹ بچے کو کہہ رہا تھا: "ڈرو نہیں، لال بہادر کچھ نہیں کہتا، بہت وفادار اور قابلِ اعتماد ہاتھی ہے۔"

وہاں سے خدا حافظ کہہ کر ہم لوگ چٹاگانگ واپس آگئے۔ ابھی بیس روز بھی نہ گزرے تھے کہ اخبار میں خبر چھپی کہ کرنل نبلٹ کو ان کے اپنے ہاتھی لال بہادر نے پاؤں تلے روند کر ہلاک کر دیا۔ انسانی بھروسے اور اعتماد بھی کتنی غیر یقینی چیز ہوتے ہیں۔ ہوا یوں کہ شہنشاہِ ایران کے بھائی پرنس رضا ہاتھی کے شکار کے لئے آئے اور لال بہادر پر بیٹھ کر کرنل نبلٹ کے ساتھ شکار کے لئے نکلے۔ جب کسی اہم شخصیت کو شکار کھلایا جاتا ہے تو شکار کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے جس جانور کے شکار کا پروگرام ہو، اسے سدھا کر کسی خاص مقام پر محصور رکھا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک ہاتھی ایک مخصوص جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ اس جگہ پہنچنے سے پہلے ایک اور جنگلی ہاتھی سامنے آگیا۔ شہزادہ نے اس پر گولی چلائی ہی تھی کہ لال بہادر بدک گیا، اور بے قابو ہو کر بے تحاشا اور بری طرح بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ پہلے مہاوت گرا، پھر شہزادہ اور پھر نبلٹ۔ جونہی کرنل نبلٹ گرے، ہاتھی نے اپنے پاؤں ان کے اوپر رکھ کر انہیں روند دیا۔ اور خاموش ہو کر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا، جیسے کہ لال بہادر کا اصل مقصد کرنل نبلٹ کو ہلاک کرنا تھا۔ پرنس کا کہنا تھا کہ لال بہادر اس قدر پرسکون انداز میں کھڑا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ چند منٹ پہلے والا مست ہاتھی لال بہادر

نہیں کوئی اور تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کرنل نبلٹ نے ہاتھی کا دانت کچھ عرصہ پہلے کھنچوایا تھا، کہا جاتا ہے کہ کینہ پرور ہاتھی نے اس طرح اس سے بدلہ لے لیا۔ جب پرنس رضا خود کو گھسیٹ کر نبلٹ کے پاس گئے تو وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ اس نے یہی کہا کہ "یور ہائی نس! میری جیب میں سو روپے کا نوٹ پڑا ہے۔ یہ سرکاری روپیہ ہے اسے سرکاری خزانہ میں دے دیجئے گا۔" اس کے بعد نبلٹ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملا۔ کیا میں یہ کہوں کہ انگریز زندگی کے آخری سانسوں میں بھی دکھاوے کی ایک چال چل گیا یا کہ فرائضِ منصبی میں دیانتداری ان غیر ملکی حاکموں کی گھٹی میں رچ چکی تھی۔ بس کچھ بھی سہی، مگر کرنل نبلٹ کی موت سے چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کی تاریخ کا ایک اہم دور ختم ہو گیا۔

چٹاگانگ واپس آکر ہم لوگ چند ہی روز رہے کہ رضا کو چواڈانگہ کی سب ڈویژن کا چارج مل گیا۔ اس مرتبہ اس کوہ و بحر کی سرسبز اور حسین وادی میں ہمارا قیام بمشکل ایک مہینہ رہا اور اس ایک ماہ میں میرے ساتھ گیا ہوا ملازم لڑکا غلام محمد سرکٹ ہاؤس کے ملازموں سے باقاعدہ جوا کھیلنا سیکھ چکا تھا اور اس کی اس بری عادت کے ہاتھوں میں سخت بیزار تھی۔ اس لئے چٹاگانگ سے وابستگی کے باوجود سرکٹ ہاؤس چھوڑنے کا رنج نہ ہوا، اور ہم اپنی منزل کو جانے کے لئے نئی چلنے والی ٹرین ایرو پر ڈھاکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

چواڈانگہ مشرقی پاکستان کی جنوب مغربی سرحد پر آخری سب ڈویژن تھی۔ تقسیم سے پہلے اس کا کچھ حصہ ضلع ندیا میں شامل تھا جو کہ پاکستان کے حصے میں آگیا اور اس حصہ کو باقی ضلعوں کو کانٹ چھانٹ کر کے چواڈانگا سب ڈویژن کی موجودہ شکل میں ترتیب، دے دیا گیا۔ یہاں جانے کے لئے کئی قسم کی سواریاں استعمال کرنا پڑتیں یعنی ہمیں چٹاگانگ سے ڈھاکہ پہنچنا تھا جہاں سے گولنڈو گھاٹ جانا تھا۔ گولنڈو گھاٹ

سے اسٹیمر پر سمندر نما دریا پار کر کے بہادر آباد گھاٹ اترنا تھا۔ جہاں سے بڑی پٹڑی کی ٹرین پر کئی گھنٹوں کا صبر آزما سفر طے کر کے اپنی منزل پانی تھی۔

ہم نے بجائے ڈھاکہ کے نرائن گنج سے گاڑی پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں حبیب الرحمٰن نرائن گنج کے ایس ڈی او تھے۔ یہ صاحب ہم لوگوں کے ساتھ چٹاگانگ سرکٹ ہاؤس میں تین ماہ باہم گزار چکے تھے۔ بڑی پیاری فطرت کے مالک، ہنس مکھ اور پُرخلوص تھے۔ ہنوز مجرّد ہونے کے باعث اپنے وسیع و عریض بنگلے میں تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ نرائن گنج صنعتی علاقہ ہونے کے ناطے سے انتظامی طور پر کافی مشکل اور مصروف رکھنے والی سب ڈویژن ہے۔ ہم لوگ اپنی آمد کا تار دے چکے تھے۔ لہٰذا حبیب صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہمیں اسٹیشن پر ملے۔ ان کی جیپ میں ہم لوگ ان کے دولت کدہ پر گئے جہاں چار گھنٹے ہم نے گزارنے تھے۔ کھانے کے علاوہ باقی تمام وقت ہم نے باتوں میں گزارا۔ پچھلی باتیں دہرائی گئیں۔ ولایت کے مختصر قصے سنائے گئے۔ چونکہ ان سب کو ولایت میں جا کر ایک سے حالات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ لہٰذا ایک وقت میں وہاں نہ جانے کے باوجود قصوں میں یکسانیت تھی۔

ولایت کا قیام بھی خوب تھا۔ سیر و سیاحت کے علاوہ اپنے نوجوانانِ وطن کے اعصابی اضطراب کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ کردار کی لغزش، بیدار مغزی اور کامیابی کا نشانِ امتیاز سمجھی جانے لگی تھی۔ شرافت اور کثافت کے تانے بانے آپس میں اس طرح اُلجھ گئے تھے کہ ان کے سرے پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ مغربی پاکستان کے چند ثابت قدم حضرات کو تیس ہزاری یعنی بے انتہا کنجوس کا لقب دیا گیا تھا اور بنگالی نوجوانوں کے اعتدال کو پسماندگی، بزدلی اور پیش قدمی کے جذبے کے فقدان سے موسوم کیا جاتا۔ قلیل مدّتِ قیام نے ذہنوں میں عجیب افراتفری مچا رکھی تھی۔ یارانِ محفل

میکدۂ مغرب میں ہر نوع کی مے چکھنے کو بے تاب نظر آتے تھے۔ اسی روا روی کے ماحول میں ہمارے ایک دوست پیر علی نظیر بھی تھے۔ شرمیلی طبیعت کے سانولے سے نوجوان' جب دوستوں کا جی اپنے وطن کے کھانے کھانے کو مچلتا تو یہی دیگچی لے کر پکانے بیٹھ جاتے۔ اکثر بدمزہ کھانا پکانے پر دوستوں کی جلی کٹی بھی سنتے اور مسکرا کر خاموش ہو جاتے ایک روز میں نے مذاق اشہ دی۔ "نظیر بھائی آپ نہ پکائیں، آپ کوئی ان کے نوکر ہیں دیکھئے نا، بجائے مشکور ہونے کے خواہ مخواہ آپ کو باتیں سناتے ہیں۔" اپنی مخصوص بے ضرر سی ہنسی کے ساتھ بولے۔" ارے بھائی چلنے دیں، یہ کبھی تو یاد کریں گے۔" ان کے یہ سارے دوست مغربی پاکستان کے حضرات تھے۔ سب ایک ہی ملک کے باسی، لڑتے بھی تھے اور یاری میں بھی بے مثال .....

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

چار گھنٹے کے طعام اور گفت گو کے بعد حبیب الرحمٰن ہمیں ٹرین پر سوار کروا گئے۔ جب گولنڈو گھاٹ پر پہنچے اور اسٹیمر پر سوار ہوئے تو عقل حیران تھی کہ اسے کیا کہیئے۔ ایک کنارے سے دوسرا کنارا نظر نہیں آتا تھا۔ دریا کیا تھا پورا سمندر تھا کوئی چالیس گھنٹے کے مختلف النوع سفر کے بعد خدا خدا کر کے چوآڈانگہ کا اسٹیشن آیا اور نومبر کی کھلتی دھوپ میں وہ سنسان سا اسٹیشن مجھے واقعی اچھا لگا۔

وہاں کے ناظر صاحب کے ساتھ ایک مجسٹریٹ گوہر علی بھی ہمیں لینے کے لئے آئے تھے۔ اسٹیشن کے باہر ایک ٹرک نما جیپ کھڑی تھی جو بظاہر پورے اسٹیشن کی واحد سواری نظر آرہی تھی۔ اسی جیپ میں جب سامان اور ہم بآسانی سما گئے تو اس کی ہونک سی ہیبت مجھے زیادہ بری نہ لگی۔

چوآڈانگہ میں ایس ڈی او کا گھر انیسویں صدی میں انگریزوں کی تعمیر کردہ اس وقت کی مخصوص سرکاری عمارت کا نمونہ تھا۔ اس زمانہ کی سرکاری عمارات فوجی طرز کی بارکوں کی مانند ہوا کرتی تھیں۔ چار بڑے بڑے کمرے ایک قطار میں بنا دیئے گئے تھے بہت بلند دیواریں، موٹے لوہے کے گرڈروں والی چھتیں اور اونچے اونچے دروازے جن کے دو دو انچ چوڑی لکڑی کے بنے ہوئے ٹوٹاں ھلبل سے کواڑ ہوا کے لئے کھولے جا سکتے تھے۔ ان کمروں سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر ایک پانی کا ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ایک کچا سا کمرہ باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کمروں کے سامنے کشادہ برآمدہ اور اس کے آگے بہت کافی زمین کے گرد چہار دیواری بنا کر اسے مکان کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ اس لق و دق احاطے کے بالکل آخری بائیں سرے پر ایک کمرہ یونہی بنا ہوا تھا۔ غالباً گائے وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہوگا۔ بجلی یا دیگر جدید سہولتیں تو خیر سرے سے ہی موجود نہ تھیں۔ مکان کی عمارت بھی طویل المیعاد ہونے کے باعث بہت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ گو تازہ تازہ کی ہوئی سفیدی اور روغن اس کے عیوب کی حتی الامکان پردہ داری کرتے مگر جگہ جگہ سے دیواروں کے دراڑ عمارت کی ناپختگی کے مظہر تھے۔ ایک کمرہ میں دو تخت پلنگ کے طور پر پڑے تھے اور چند بازو والی دفتر میں استعمال کی جانے والی کرسیاں ڈائننگ روم کا پتہ دے رہی تھیں۔

ایک تو اپنے گھر سے ہزاروں میل دور بالکل نئی جگہ عجیب وضع قطع کا بغیر کسی سہولت کے مکان کی رہائش، سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ دوسرے روز علی الصبح میرے شوہر نے سب ڈویژن سے خود کو واقف کرنے کے لئے دورے پر جانے کا اعلان کر دیا۔ کچھ نہ پوچھئے کس قدر غصہ آیا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ مگر قہر درویش برجان درویش، خاموش رہی۔ شوہر تو صاحب بہادر کی طرح رسان سے دورے

پر چل دیئے اور میں ہر چیز کو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق یاسیت سے آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی کہ گھر داری کو اس عجیب و غریب ماحول میں کیسے جمایا جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد گوہر علی بمعہ اپنی بیگم کے آگئے۔ وہ مجھے ہر طرح کی امداد دینے پر مصر تھے۔ یہ صاحب مجسٹریٹ کے علاوہ مقامی انتظامیہ کے سیکنڈ افسر تھے۔ یعنی دوسرے درجے پر افسر اعلیٰ۔ کلکتہ سے بمع اپنی ہندو بیوی کے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے۔ بہت مفید اور مددگار انسان۔ بلکہ مجھے تو اللہ دین کے چراغ والے جن لگے۔ ان کے مقامی ہندو آبادی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ چونکہ وہاں کا کھانا پینا، کاریگر و ہنرمند طبقہ ہندوؤں ہی کا تھا۔ لہٰذا وہ ہر کام بہت آسانی سے کروا دیتے۔ فوراً ہی انہوں نے مجھے نہ جانے کہاں سے مہاگنی کی لکڑی کا ایک جوڑا پلنگ خرید دیا۔ دیگر اشیائے خانہ داری کے علاوہ ایک بہت عمدہ دودھ دینے والی گائے بھی خرید لی گئی۔ غرضیکہ گوہر علی کی مدد سے چار روز میں پورا گھر اس طرح سیٹ ہو گیا کہ یوں لگتا تھا جیسے عرصہ سے ہم یہاں ہی مقیم ہیں۔ جب میرے شوہر واپس آئے تو معمولی چیزوں کے ساتھ گھر کی آرائش مکمل ہو کر امورِ خانہ داری میں خاصی باقاعدگی آچکی تھی۔

چواڈانگہ کی سب ڈویژن کلکتہ کی سرحد پر واقع تھی اور بھارت و پاکستان کی حدود کی تقسیم اس علاقہ میں کچھ اس طرح تھی کہ رہائشی گھر پاکستان میں ہے تو ڈھور ڈنگروں کا طویلہ بھارت میں . . . خود بھارت میں رہ رہے ہیں تو پانی کی ضرورت پاکستان سے پوری کی جا رہی ہے۔ کاروبار پاکستان میں ہے ضروری اشیاء لانے کے لئے بھارت جا رہے ہیں۔ اس سرحد کے دیہاتوں میں رہائش اور ضروریاتِ زندگی دونوں ممالک کے درمیان اس طرح خلط ملط ہو گئی تھیں کہ لوگوں کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے پر پابندی لگانی بالکل ناممکن تھی۔ یہی وجہ

تھی کہ جو اڈا اسمگلنگ کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ دن میں اسمگل کی جانے والی اشیاء سرحدی دیہاتوں کے گھروں میں چھپا دی جاتیں اور رات کو اِدھر اُدھر کر دی جاتیں چونکہ ان دیہاتوں میں مرکزی ذریعہ معاش اسمگلنگ ہی تھا۔ اس لئے دیہاتی کسی طرح انتظامیہ کے لئے مخبری کرنے کو تیار نہ تھے۔

وہاں کی معیشت مکمل طور پر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ ہندو مہاجن، ہندو سرمایہ دار ہندو تاجر اور ہندو ہی کاریگر۔ مسلمانوں کی معیشت ہندوؤں کے تابع تھی۔ یعنی وہ ہندوؤں کے کارندے تھے۔ یا ان کے لئے کاروبار چلاتے تھے، ماسوائے چند ایک معزز مسلمان گھرانوں کے تمام معززینِ شہر ہندو تھے۔

سنا تھا کہ تقسیم کے فوراً بعد مدراس اور کلکتہ کے مسلمان سرمایہ دار یہاں آئے تھے۔ مگر ایسی مہارت اور کمال کے ساتھ عوام کے ذہنوں کو موڑا گیا کہ انہوں نے مسلمان مہاجر سرمایہ داروں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا مسلمان سرمایہ دار کہیں اور چلے گئے یا واپس لوٹ گئے، اور وہ ہندو جو تقسیم پر بھارت جا چکے تھے پھر واپس آ گئے اور یہاں کی معیشت کو مکمل طور پر ہاتھ میں لے کر اس علاقہ کو اسمگلنگ کی جنت بنا دیا۔ عموماً مقامی مسلمان غریب بھی تھے اور جاہل بھی۔ مگر ان ہی مسلمان اہلِ وطن کی محنت اور خون پسینے کی کمائی سے ہندو سیٹھ کروڑپتی بنے تھے۔

"تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"

ہندو سیٹھوں کا شعارِ زندگی یہ تھا کہ روپیہ کمانے کے لئے وہ پاکستان رہتے مگر ان کے اہل و عیال کلکتہ میں مقیم تھے۔ جو روپیہ یہاں سے کماتے اسے ٹھاٹھ سے کلکتہ میں خرچ کیا جاتا۔ سیٹھوں کے اس عیارانہ چکر میں غریب مسلمان پس رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھے اور انہیں کوئی شکوہ نہ تھا۔ طرہ یہ کہ

اپنی معیشت کے ان قاتلوں کو اپنا محسن اور اپنے معاشرے کا لازمی جزو سمجھتے۔

ان حالات کا صحیح اندازہ مجھے کلکتہ جا کر ہوا۔ ہم لوگ تین روز کے لئے کلکتہ گئے ذکریا سٹریٹ کے ایک متوسط طبقے کے مسلم ہوٹل میں ٹھہرے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب خالص ہندوآنہ طرز کی دھوتی اور کرتے میں آئے۔ ان کے ہمراہ ان کا ایک بیٹا اور ایک نوجوان بیٹی بھی تھی۔ معلوم ہوا کہ چواڈانگہ کے سیٹھ صاحب موتی بابو ہیں اور ان کا خاندان جو تین بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل ہے۔ مستقل طور پر کلکتہ میں رہائش پذیر ہے۔ ان کا بیٹا اور بیٹی جوان کے ساتھ تھے نہایت مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ سیٹھ صاحب تو ایک طرف مگر ان کے دونوں بچے ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ ہم لوگ ان کے گھر چلیں (یہ خفیف سی سہی، مگر شاطرانہ چال ملاحظہ فرمائیے) کچھ تو ان کا گھر دیکھنے کا تجسس اور کچھ وہ دونوں ہمیں "چاچاجی، چاچاجی" کہہ کر اتنی اپنائیت سے اصرار کر رہے تھے کہ انکار کی گنجائش بالکل نہ رہی اور ہم دونوں اپنے بچے کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلے۔

ذکریا اسٹریٹ کی تنگ گلی میں دو لمبی لمبی نہایت شاندار موٹریں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑی اپنی چمک دمک سے اپنے مالک کی بے شمار دولت کی شہادت دے رہی تھیں۔ ایک موٹر کو سیٹھ کا بیٹا رامو چلا رہا تھا۔ اسی موٹر میں ہم سیٹھ صاحب کی بیٹی شانتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور دوسری موٹر میں سیٹھ صاحب ڈرائیور کے ساتھ تنہا بیٹھے۔ ایک بہت بڑی تین منزلہ بلڈنگ کے احاطہ میں جا کر موٹریں رکیں تو سیٹھ صاحب کی بہو اور دو بیٹیاں پذیرائی کو آگے بڑھیں اور ہمیں اپنے جلو میں لیتی ہوئیں شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

میں تو تصویر حیرت بنی ہر چیز کو دیکھتی رہی۔ ہر ہر چیز سے امیرانہ اور رئیسانہ شان و شوکت ٹپک رہی تھی ۵

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اس عالیشان عمارت کے ہر دوسرے کمرے میں ٹیلیفون تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہمارے عزیب اور سادہ لوح ہم وطنوں کے خون سے بہت رنگین دنیا آباد کر رکھی تھی۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس ٹھاٹھ باٹھ اور آن بان کے پس پشت بے شمار مدقوق اور ناتواں ہم وطنوں کے چہرے نظر آتے۔ سیٹھ صاحب کے سب کے سب نوجوان، صحت مند، خوش پوش اور بے فکرے بچے ہمیں گھیرے ہوئے اعلیٰ درجہ کی مہمان نوازی کی کوشش کر رہے تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے میز پر چنے ہوئے تھے اور میرے تصور کی سکرین پر اپنے وطن کے وہ بے شمار لوگ سینما کی تصویروں کی مانند پھرک رہے تھے۔ جنہیں دو وقت دال بھات نصیب نہیں۔ مگر ان کا خون پسینہ سیٹھ کے بچوں کو کلکتہ میں دنیا کا ہر عیش فراہم کر رہا ہے۔

چوآڈانگہ واپس آکر میرے شوہر نے سیٹھ صاحب کو "شوکاز" کا نوٹس بھیجا، کہ وہ قانونی وسائل بتائیں جن کی بدولت وہ اہل و عیال کو اس ٹھاٹھ سے کلکتہ میں کفالت کر رہے ہیں اور اس بنا پر انکا پاسپورٹ منسوخ کر دیا گیا۔ مگر اس ایک سیٹھ پر ہی کیا منحصر، وہاں تو بہت سے ایسے سیٹھ جونک کی طرح معیشت کو آہستہ آہستہ چوس رہے تھے کہ اپنے سادہ لوح ہم وطن ان کی اس حرکت کو بھی اداتے دلنوازی سے تعبیر کرنے لگے۔ بس جناب کیا کہوں۔ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد، سینہ کجا کجا نہم

مجموعی طور پر وہاں کے لوگوں کا طرز بود و باش بہت سادہ تھا۔ ہمارے قریب ایس۔ ڈی۔ پی۔ او (سب ڈویژنل پولیس آفیسر) ممتاز علی صاحب کا گھر تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ چھوٹے کپتان پولیس تھے۔ کثیر الاولاد تھے اور مشکل سے گزر بسر کرتے تھے

اپنے یہاں کے پولیس کپتان کے گھر کا معیار جب میرے ذہن میں آتا تو میں ممتاز صاحب کی زندگی کا جائزہ لینے لگتی۔ ان کے گھر میں چند کرسیاں اور ایک بڑا پلنگ، کل فرنیچر تھا۔ یہ پلنگ مہمانوں کو احتراماً پیش کرنے کے لئے یا محض نمائش کے لئے تھا۔ ورنہ تمام افرادِ خانہ نیچے چٹائیوں پر سوتے تھے۔ ایک روز ایک چھوٹی بچی کے کان میں کیڑا چلا گیا جو مسز ممتاز علی نے خود ہی چھوٹی چمٹی سے نکال دیا اور دوسرے دن اپنے کارنامے کو بہت فخر سے میرے سامنے بیان کیا۔

بڑی بچی جو کہ بمشکل سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں تھی اور اور مسز ممتاز علی باقی دو کمسن بچیوں کو بیاہنے کو تیار تھیں۔ وہ ایک سچی پتی ورتی خاتون تھیں، جن کی دنیا محض شوہر اور بچوں تک محدود تھی۔

منصور علی صاحب وہاں کے فرسٹ آفیسر اور مجسٹریٹ تھے۔ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ سرکاری ملازم تھے۔ لیکن ہر وقت سیاسی جوڑ توڑ میں لگے رہتے اور اس مشغلہ میں ان کی بیگم بھی شریک تھیں۔ چند مہینے وہاں رہے اور پھر نہ جانے کس نگر دم میں لگ گئے۔

گوہر علی اور ان کی ہندو بیوی جو کہ ایف اے پاس تھی، وہاں کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی جان تھے۔ مجھے ہر کام اور ہر بات میں مدد دیتے ان کی دو بیٹیاں نُوچنگ اور مُوچنگ میرے بچے کے کھیل کی ساتھی تھیں۔

ملک صاحب کا گھرانہ چوآڈانگہ کے مسلمانوں میں معزز ترین گھرانہ سمجھا جاتا۔ ملک صاحب پرانے زمیندار تھے۔ ان کے تین صاحبزادے حکومتِ پاکستان کے اعلےٰ عہدہ دار تھے۔ بڑا (مسٹر باری) چٹاگانگ پورٹ ٹرسٹ کا چیرمین تھا۔ منجھلا (ڈاکٹر مالک جو مشرقی پاکستان کے آخری گورنر بنے) سوئٹزرلینڈ میں سفیر کے عہدے پر فائز تھا۔ اور چھوٹا (حفیظ الرحمٰن) ان دنوں ایک کورس کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا

تھا۔ یہ سول سروس کا اعلیٰ عہدہ دار تھا۔ ان کی اہلیہ اپنی دو ننھی بچیوں لوکھیؔ اور ٹیتھیؔ کے ساتھ شوہر کی غیر حاضری میں سسرال رہ رہی تھیں۔ مسز حفیظ الرحمٰن ملک جب تک وہاں رہیں ہم ہر روز ایک دوسرے سے ملتیں۔ زیادہ تر میں ہی ان کے یہاں جاتی کیوں کہ ان کی سسرال پرانی روایات کی حامل تھیں۔ لہٰذا بہو کا زیادہ باہر جانا مناسب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے ملک صاحب کو میں نے ہمیشہ گینجی (بنیان) اور تہہ بند میں پایا۔ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بیٹے بھی جب کبھی چوآڈانگہ آتے تو سوٹ وغیرہ کو خیرباد کہہ کر یہی لباس اپنا لیتے۔ بڑے ملک صاحب کی بیگم معمر خاتون تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے کمرے میں نوکرانیوں کے جھرمٹ میں پلنگ پر بیٹھی رہتیں اور سوتی سفید ساڑھی بغیر بلاؤز کے اپنے گرد لپیٹے ہوتیں۔ یہی لباس نوکرانیوں کا ہوتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی ساڑھی صاف اور نوکرانیوں کی ملگجی ہوتی۔ مسز حفیظ ملک ہمیشہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کرتیں۔ وہ بہت خوش پوش اور حسین خاتون تھیں۔ سروقد، متناسب جسم پر نہایت دلکشی سے ساڑھی باندھتیں اور لمبے لمبے بالوں کو عموماً پیچھے کھلا چھوڑ دیتیں۔ ان کے والد مشرقی بنگال کی اسمبلی کے سپیکر رہ چکے تھے۔ وہ اچھے گھرانے کی بیٹی اور اچھے گھرانے کی بہو تھیں۔ اعلیٰ ظرفی اور خوش اخلاقی ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ میں ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ لیکن جلد ہی ان کے شوہر امریکہ سے واپس آگئے اور وہ ان کے ہمراہ ڈھاکہ چلی گئیں۔

چوآڈانگہ میں گھر کو ٹھیک کرنے کے بعد جو پہلا کام ہم نے کیا وہ دو استاد مقرر کرنا تھا۔ یہ دونوں ہندو پنڈت صبح شام ہمارے گھر آتے ایک پنڈت جی صبح کے وقت مجھے گانا سکھلاتے اور دوسرے پنڈت جی میرے شوہر کو شام کے وقت بنگالی پڑھاتے میرے پنڈت جی مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کے گانے جنہیں رابندرو شنگیت کہا جاتا ہے سکھانے پر مصر تھے۔ مجھے کتنی تمنا تھی کہ وہ کوئی غزل سکھلائیں۔ مگر انہیں تو اردو کا

ایک شعر بھی نہیں آتا تھا۔ ہر گیت میں میگھ یعنی بادل کا ذکر ضرور آتا اور گوگوں کے بھول کا رومان پورے سنگیت پر محیط ہوتا۔ ایک گانا انہیں بہت پسند تھا۔ جس کے بول یہ تھے۔ میگھو بریت ایلو بروشا۔ کتھائے تھیں (یعنی آسمان پر بادل چھا گئے ہیں اور برسات کا موسم آگیا۔ تم کہاں چلے گئے ہو) یہ دونوں پنڈت صاحبان گویا ہم دونوں کو بنگالی زبان اور بنگالی کلچر سے آشنا کر رہے تھے۔ ویسے بھی پنڈت کا لفظ اس قدر چونکا دینے والا نہیں تھا کیوں کہ وہاں پر پڑھے لکھے یا عالم شخص کو پنڈت کہا جاتا تھا اور اکثر مسلمانوں کے بھی کچھ ہندوانہ ڈاک نام (پیار سے پکارنے والے نام) ہوا کرتے تھے مثلاً حفیظ الرحمٰن کا ڈاک نام شانتی تھا۔

اس علاقہ میں گلدار اور کوبرا سانپ بہت تھے۔ ایک شام کو عجیب واقعہ ہوا، کہ میرے شوہر شکار سے آئے اور اپنے ساتھ ایک گلدار مار کر لائے۔ باہر لان میں کرسیاں بچھی تھیں ان کے قریب مردہ شیر رکھ دیا گیا۔ ان ہی دنوں گائے کا دودھ بہت کم ہو گیا تھا۔ میں ملازم پر ناراض ہوتی تو وہ کہتا "بیگم شاب بُڈھے شاپ کھٹے جٹے" (بیگم صاحب میرے خیال میں سانپ پی جاتا ہے) میں اس کی اس بات کو بے معنی اور غلط بیانی سے تعبیر کرتی۔ مگر اس روز جب ہم مردہ شیر کے پاس بیٹھے شکار کی باتیں کر رہے تھے کہ ملازم گائے کے کمرہ سے خوف زدہ حالت میں بھاگا آیا اور چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ کہنے لگا کہ سانپ گائے کا دودھ پی رہا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت پنڈت جی بھی آگئے۔ اور رضا اور پنڈت جی بھاگے ہوئے گئے۔ رضا کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ مگر سانپ نے گائے کے پچھلے پاؤں کو کنڈلی مار کر اس طرح جکڑ رکھا تھا گویا رسی سے باندھ دیا ہو اور خود مزے سے بچے کی طرح منہ لگا کر دودھ پی رہا تھا۔ اب اگر بندوق چلائیں تو گائے کو گولی لگنے کا خدشہ تھا۔ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ سانپ ایک دم بھاگ نکلا اور چارے کی ناند کے اندر چلا گیا۔ پنڈت جی نے ناند کو ڈنڈے سے توڑ دیا۔

اور سانپ کے سر پر خاص مہارت سے ڈنڈا رکھ کر اسے کچل دیا۔ یہ ڈھائی فٹ کا زہریلا کوبرا تھا۔ پنڈت جی اسے ڈنڈے پر لٹکائے ہوئے لائے اور شیر کے پاس لاکر رکھ دیا۔ بجلی تو تھی نہیں۔ اس افراتفری میں گیس کا ہنڈا ٹوٹ جانے سے گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں صرف ایک حقیقت سامنے تھی۔ کوبرا سانپ اور شیر، مجھے یوں لگتا، کہ دونوں اٹھ کر ابھی حملہ کر دیں گے۔ وہ تھوڑی دیر جب تک کہ روشنی نہ آئی مجھ پر قیامت بن کر گزری۔ بعض اوقات تو مجھے یوں لگتا جیسے اس سانپ اور شیروں کی بستی میں مجھے موت ہی لے کر آئی ہے۔

گرمی ایک مزید آزمائش بن کر آئی۔ بجلی نہ ہونے کے باعث پنکھا تو تھا ہی نہیں، دن کو تو کسی نہ کسی طرح چھت پر لگا ہوا ہاتھ سے چلانے والا پنکھا چلتا رہتا۔ مگر رات کو گرمی میں کمروں کے اندر سونا میرے لئے محال تھا۔ باقی سب دوستوں سے اس مشکل کا حل پوچھا۔ انہوں نے حیرانی سے میرے مسئلہ کو سنا کہ وہ تو کمروں میں سونے کے عادی تھے دروازے بند کر کے کمروں میں سوتے اور اس آسانی سے اس مسئلے پر قابو پانے والے وہ سب دوست مجھے کسی دوسری دنیا کے باسی لگے۔

ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا سینما گھر تھا۔ اس کا اپنا بجلی پیدا کرنے والا جنریٹر تھا۔ سینما کے قریب ہی ایک چھوٹی سی عمارت میں کلب تھا۔ جب تک سینما چلتا کلب کو بھی بجلی میسّر رہتی۔ ہماری واحد تفریح یہ کلب تھا۔ شام کو کلب چلے جاتے۔ وہاں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ممبر شپ کی کوئی خاص شرائط نہ تھیں۔ لہٰذا کچھ کلرک بھی آتے۔ ہم لوگ پنگ پانگ کی کچھ گیمز کھیلتے اور پھر برج ٹیبل پر آجاتے۔ برج بغیر اسٹک کے کھیلی جاتی محض تفریح طبع کے لئے، جوئے کے طور پر نہیں۔ برج اور شطرنج وہاں کے مرغوب ترین کھیل تھے۔ میں نے شطرنج وہاں کے ایک کلرک سے ہی سیکھی جو کلب کا ممبر تھا۔ اور شطرنج کا اچھا کھلاڑی تھا۔ کلب میں میں واحد ہی خاتون ہوتی۔ کبھی کبھی میرا ساتھ

دینے کے لئے مسز گوہر علی آجاتیں، گھل مل کر چند گھنٹے گزار لیتے۔ افسر بھی ماتحت بھی۔ افسر اور ماتحت میں ایک خاص قسم کا بُعد اور تفریق جو ہمارے یہاں جنم پا چکی ہے۔ ابھی وہاں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میرے شوہر اس علاقے کے اعلیٰ افسر اور سربراہ تھے مگر کبھی بھی کسی کو خوشامد کرتے، میں نے نہ دیکھا۔

وہاں سب ہی بنگالی بولتے یا پھر پڑھے لکھے مرد ہماری سہولت کے لئے انگریزی بھی بول لیتے۔ میرے شوہر تو بنگالی پڑھ لکھ سکتے تھے۔ بلکہ تقریریں بھی بنگالی میں کرتے مگر میں ابھی تک ٹوٹی پھوٹی بنگالی بولتی۔ بنگالی بولے بغیر چارہ نہ تھا۔ سب خواتین سے بنگالی میں گفتگو ہوتی۔ گھریلو ملازمین سے بنگالی ہی بولنی پڑتی۔ لے دے کے وہ ملازم لڑکا غلام محمد یا میرا بچہ اور شوہر تھے۔ جن سے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اُردو بول لیتی جب بنگالی بول بول کے زبان تھک جاتی تو میرے ذہن میں چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں مقیم اپنے دوست آجاتے جو سالہا سال سے وہاں رہنے کے باوجود ایک لفظ بنگالی کا نہیں بولتے تھے۔ انہیں ضرورت ہی نہ تھی اور میں دل ہی دل میں ان کی قسمت پر رشک کرتی۔

ایک دن میرے شوہر نے مجھے سب ڈویژن کی پرانی کتاب دکھلائی۔ جن میں پہلے کے تمام ایس ڈی اوز کی لسٹ بھی تھی۔ ان میں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ جب میں تنگ آتی میرے شوہر مجھے طعنہ دیتے کہ "انگریز جب یہاں بخوشی رہ سکتے تھے تو ہم غریب ملک کے باشندوں کو یہ نازک مزاجی زیب نہیں دیتی کہ اپنے ملک کے ایک حصے سے محض اس لئے ناخوش ہوں کہ وہاں بجلی نہیں ہے یا دوسری فروعی وغیر ضروری سہولتیں نہیں ہیں۔"

چوآڈانگہ کے آخری اسٹیشن درشنا سے کلکتہ کی سرحد بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ درشنا میں غیر ملکی صنعت کاروں کی ایک شوگر مل تھی۔ اس کا نام کیرو شوگر مل تھا۔

یہ پاکستان میں واقع تھی۔ لیکن اس کا ہیڈکوارٹر کلکتہ میں تھا۔ جہاں سے تمام احکامات حاصل کئے جاتے تھے۔ اس مل کا جنرل مینجر مسٹر کائل انگریز تھا اور پورے طمطراق سے رہتا تھا۔ مل کا اکاؤنٹنٹ مسٹر گارلس یونان کا باشندہ تھا اور مسٹر کائل کے مقابلہ میں سادہ لوح اور عزیب الطبع تھا۔ کائل اسے کنجوس اور مکھی چوس کہتا۔ ان دونوں کی بمعہ ان کی بیویوں کے ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی۔ مسز کائل تو صاحب اختیار اور ذی اثر شخص کی بیوی ہونے کے ناطے میں خاموش رہتیں۔ مگر مسز گارلس میرے سامنے ہمیشہ مسز کائل کی مختلف النوع برائیاں کرتی۔ ان لوگوں کا کاروبار تو پاکستان میں تھا۔ مگر ذہنی وابستگی بھارت کے ساتھ تھی۔ گھریلو ضروریات کی اکثر چیزیں کلکتہ ہی سے آتیں۔

چوآڈانگہ ضلع کشتیہ کی سب ڈویژن تھی اور کشتیہ کے ڈپٹی کمشنر کفیل الدین محمود پڑھنے لکھنے کے شوقین، منکسر المزاج اور ہر قسم کے تصنع سے آزاد نہایت پُرخلوص انسان تھے۔ مسز کفیل الدین کے والد سلطان الدین ان دنوں انڈونیشیا میں پاکستان کے سفیر تھے۔ مسز کفیل الدین خلوص و محبت میں میاں سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر تھیں۔ یہ لوگ ہمیں اکثر کشتیہ بلواتے جہاں ہمارا قیام تورسیٹ ہاؤس میں ہوتا۔ مگر ناشتہ تک ان کے یہاں سے آتا اور یہ مہمان نوازی رات کے کھانے تک مسلسل قائم رہتی جس طرح کی میں بنگالی بولتی مسز کفیل کی اردو بھی اس سے بہتر نہ تھی۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی غلطیوں کی تصحیح ہنس ہنس کر کرتیں۔

ہنستے بولتے دن گزر رہے تھے کہ مجھے مغربی پاکستان میں والدین کے پاس تین ماہ کے لئے آنا پڑا اور نومبر کے شروع میں میرے شوہر ڈھاکہ ائرپورٹ پر جہاز پر مجھے سوار کروا کر چوآڈانگہ اپنی اسی دنیا میں واپس چلے گئے۔

جو تِرے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

یہ ۱۹۵۷ء کے اوائل کی بات ہے کہ ابھی میں بنگال واپس جانے کا پروگرام بنا ہی رہی تھی کہ اطلاع ملی کہ ہمارا تبادلہ چوآڈانگہ سے مانک گنج ہوگیا ہے۔ میں چوآڈانگہ کے فاصلے اور چالیس گھنٹے کے لامتناہی سفر سے بہت خائف تھی۔ لہٰذا اس خبر سے بہت خوش ہوئی کہ چلو ڈھاکہ سے چالس میل کے فاصلے پر ایسا مقام مل گیا جہاں سے جب چاہا ڈھاکہ ہو آئے، دوستوں سے مل لئے۔ ضرورت کی اشیا، خرید لائے۔ چنانچہ میں دل میں نئی جگہ کا شوق لئے ہوئے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اتری۔ ان دنوں اتفاق سے میں کچھ اس طرح علیل تھی کہ ڈاکٹر نے زیادہ چلنا پھرنا بند کر رکھا تھا۔ میرے شوہر اس صورتِ حال کو دیکھ کر کچھ گھبرا گئے۔ مانک گنج میں ناظر کو اطلاع دی کہ جیسے بھی بن پڑے گھاٹ سے گھر تک کسی سواری کا بندوبست کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ سوائے ڈولی کے

اور کوئی سواری دستیاب نہیں۔ اسی کو غنیمت جان کر بندوبست کرنے کو کہہ دیا۔

اپنا شوق تو اسی بات سے ٹھنڈا پڑ گیا تھا کہ چوآڈانگہ میں بہرحال ایک ٹرک نما جیپ تھی ہی جو جیپ کم اور چھپر کٹ زیادہ تھی۔ جس کا میں اکثر مذاق ہی اڑاتی تھی غالباً کوئی بڑا بول ہی سامنے آیا۔ معلوم ہوا کہ جیپ کیا مانک گنج میں رکشا بھی نہیں چل سکتا۔ سرے سے سڑکیں ہی نہ تھیں۔

قہر درویش، برجان درویش۔ ڈھاکہ کے بادام تلی گھاٹ پر پہنچے۔ گھاٹ کا بھی منظر خوب تھا۔ دریا کے کنارے ایک دنیا آباد تھی۔ بہت بڑی لانچوں کے علاوہ کنارہ پر حدِ نظر تک بڑی بڑی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ ان کشتیوں پر بانس یا لکڑی کا نیچا سا چھت بھی ڈال دیا جاتا ہے اور ہر کشتی میں پورا خاندان آباد ہوتا ہے۔ اس کشتی کے اندر ہی پورے خاندان کی ضروریات زندگی بھی جمع ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض خاندان تو مرغیاں وغیرہ بھی وہاں ہی پال لیتے ہیں۔ ایک بڑی لانچ کے فرسٹ کلاس کے کیبن میں بستر جما دیئے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے پوچھا "کتنی دیر میں منزل پر پہنچیں گے؟" کہنے لگے "تم کھانا کھا کر آرام سے سو جاؤ۔ صبح کو آنکھ مانک گنج میں ہی کھلے گی"۔ "ہیں؟؟" میں تقریباً چیخ پڑی۔ "آپ نے تو لکھا تھا کہ تقریباً چالیس میل ہے"۔ "وہ تو ہے ہی" وہ مسکرائے۔ "مگر خشکی اور سیدھی سڑک کے ذریعے اور سڑک ابھی سرے سے تعمیر ہی نہیں ہوئی۔ دریا کا راستہ تو بہت لمبا ہوتا ہے۔ اب تک تمہیں تجربہ ہو جانا چاہیئے۔" میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیجئے چلے تھے نمازیں بخشوانے اور الٹے روزے گلے پڑے۔ اپنی طرف سے ڈھاکہ کے قریب آنے کی خوشی تھی۔ کہتے ہیں جس جگہ کا دانا پانی قسمت میں ہو وہاں ہی انسان جاتا ہے' واہ ری قسمت تو نے بھی کہاں کہاں کا ہمارے لئے آب و دانہ منتخب کر لیا۔

جہاز کے ہلکے ہلکے ہلکوروں نے لوری دیتے ہوئے سلا دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی

تو واقعی لانچ کنارے پر لگ رہی تھی۔ میرے شوہر فخریہ بولے "دیکھا کیسا آرام دہ سفر ہے۔ پتہ بھی نہ چلا اور منزل آگئی۔ اب تم جلدی سے گھر جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"
بچوں کو جلدی سے تیار کیا اور خود مارا مار اتیار ہوئی۔ دل میں نئی سب ڈویژن دیکھنے کا شوق موجزن تھا۔ ایک تجسس لئے کیبن سے باہر آئی۔ سب ڈویژن کا کچھ عملہ بمع ناظر صاحب کے لینے آیا ہوا تھا۔ انہیں سامان کی ہدایت دے کر خشکی کی طرف رُخ کیا تو ہر امید مسمار ہوتی معلوم دی۔ دریا کے کنارے گھاٹ تو بنا ہوا تھا مگر آبادی کے کوئی نشانات نہ تھے۔ میں نے حیرت سے اپنے شوہر سے پوچھا۔ نانک گنج کتنی دور ہے" بولے "یہی میل ڈیڑھ میل"۔ تم آرام سے ڈولی میں بیٹھ جاؤ، ہم سب ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر ہولیں گے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
بادل نخواستہ ہر احساس کو دل میں دبائے خاموشی سے ایک مضحکہ خیز ڈولی میں بیٹھ گئی۔ ایک ماہ کی ننھی بچی گود میں تھی۔ اور چار سال کا بچہ جوانمردی دکھلانے کے لئے باپ کے ساتھ چلنے پر کمربستہ ہوا۔ کافی عملہ پیچھے ہو لیا اور اس طرح ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ گھر دیکھ کر کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ گو بجلی سرے سے غائب اور پانی کا واجبی سا انتظام تھا۔ مگر درختوں میں گھرا ہوا خوش وضع بنگلہ معقول سا خوبصورت لگا۔ سامنے دو بڑے بڑے تالاب بادی النظر میں منظر کو حسین بنا رہے تھے۔ ایس ڈی۔ او کے مکان کے قریب عدالت کی عمارت اور دوسرے سرکاری دفاتر تھے۔ تالابوں کے دوسری طرف سب جج اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کے پکے بنے ہوئے مکانات تھے۔ باقی تمام آبادی بانسوں کے بنے ہوئے نیچی چھتوں کے جھونپڑی نما مکانات پر مشتمل تھی۔
گھر کا تمام سامان کمروں میں بکھرا پڑا تھا۔ گو میرے شوہر کو سب ڈویژن کا چارج لئے ہوئے بیس پچیس روز گزر چکے تھے۔ مگر انہوں نے سامان کو کھلوانے پر ہی اکتفا

کیا تھا۔ گھر کو ترتیب دینے کی ذمہ داری مجھے انجام دینی تھی۔ سب سے پہلے نوکروں سے میں نے مقامی حالات جاننے کی کوشش کی۔ ہم سے پہلے ایک ہندو افسر وہاں ایس ڈی او تھے لہٰذا خانساماں بھی ہندو طرز کی ترکاریاں اچھی بناتا تھا۔ معلوم ہوا کہ گوشت ہر روز دستیاب نہیں ہوتا۔ گوشت کے لئے ہفتہ میں دو دن مقرر ہیں اور وہ بھی دور سے لانا پڑتا ہے۔ نوکروں نے رائے دی کہ گوشت کھانے کا خیال چھوڑ کر مرغی، انڈوں اور سبزیوں پر اکتفا کیجئے۔ غالباً یہ سب ہندو تہذیب کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ورنہ مسلم ملک کے ایک شہر میں مذبحہ خانہ نہ ہونے کا جواز سمجھ میں نہ آیا۔

ان دنوں معززین شہر میں سب سے زیادہ کرتا دھرتا ایک ہندو وکیل مسٹر نیوگی تھے۔ پاکستان کو بنے دس سال ہو چکے تھے۔ مگر عام انسان پر ہندو تہذیب اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ مسلمان برملا و بلا جھجک "کالی مائی" کی قسم کھاتے تھے۔ سب ڈویژن کی سماجی و معاشرتی زندگی پر ہندو تہذیب پوری طرح مسلّط تھی۔ مردوں کی تمام تقریبات اور انجمنوں کے روحِ رواں مسٹر نیوگی تھے اور خواتین میں سماجی بہبود کے کام مہیلا شمیتی نام کی ایک انجمن انجام دیتی تھی۔ جس کی کرتا دھرتا مسز نیوگی تھیں۔ ممبران میں ایک آدھ خاتون کے علاوہ سب ہندو خواتین تھیں۔

برسبیلِ تذکرہ یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر عطاء الرحمٰن وزیر اعلیٰ تھے اور مشرقی پاکستان کی اہم وزارتیں ہندو سنبھالے ہوئے تھے، اور اس طمطراق سے ہندو نوازی کر رہے تھے کہ پاکستانی جذبات سرنگوں ہو جاتے تھے ہر ہندو طالب علم کو کئی کئی وظیفے دیتے جا رہے تھے خواہ وہ طالب علم تھرڈ کلاس ہی کیوں نہ ہو۔ اکثر وظائف کے لئے ہندو ہونا لازمی شرط تھا۔ ایک ایسا وقت بھی آ گیا تھا کہ ہندو طلباء کے وظائف کے لئے مقررشدہ رقم طلباء کی تعداد سے اس قدر تجاوز کر گئی تھی کہ وظیفہ کے لئے طالب علم ڈھونڈنے پڑتے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ

اکثر ہندو لڑکے کئی وظیفے لے کر اپنی ضرورت کی رقم پاس رکھ کر باقی ماندہ روپیہ کلکتہ بھجوا دیتے تھے۔

میں بھی کہاں بھٹک گئی تو میں عرض کر رہی تھی کہ گھر پہنچ کر چائے پی کر تازہ دم ہوئے تھے کہ مسٹر و مسز نیوگی ملنے کے لئے چلے آئے۔ دوسرے دن چلڈرن شو منعقد ہو رہا تھا اور اسی سلسلے میں وہ مجھے دعوت دینے آئے تھے۔ میں نے اپنی علالت اور سواری نہ ہونے کی وجہ پیش کرتے ہوئے بہت معذرت چاہی۔ مگر ان کے مسلسل اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

مشرقی پاکستان کے دور افتادہ دیہاتوں اور قصبوں میں ایک عام مرد کام کاج کے دوران صرف لنگی پہنتا ہے اور عورتیں صرف ساڑھی استعمال کرتی ہیں۔ دونوں میں فرق محض یہ ہے کہ ساڑھی لمبائی میں اتنی ہوتی ہے کہ ایک پلو کندھے تک آجائے اسی سے عورتیں اپنی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ مگر اکثر کام کے دوران ناکام رہتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اب حالات کیا رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ مگر جب میں ان دیہی علاقوں میں تھی تو وہاں کی دیہاتی عورت بلاؤز کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس لئے بعض اوقات ایک پیچیدہ سی شرمناک صورتِ حال پیدا ہو جاتی تھی۔ کچھ اس قسم کی صورتِ حال دوسرے روز چلڈرن شو میں در پیش ہوئی۔ مسٹر نیوگی اور سرکاری ڈسپنسری کے ڈاکٹر کے ہمراہ پگڈنڈی پر پا پیادہ جونہی میں جائے تقریب پر پہنچی تو میری نظر ایک نوجوان خاتون پر پڑی جو بچے کو کولہے پر لئے کھڑی تھی۔ ساڑھی کا پلو بے خیالی میں بالکل سرک گیا تھا اور وہ عجیب بے نیازی کے ساتھ اس طرح کھڑی تھی جیسے چاکلیٹ رنگ کا خوبصورت مجسمہ ایک چابکدست فن کار کے حسین فن کی داد چاہ رہا ہو۔ میں نے محجوب سی چور نگاہوں کے ساتھ ارد گرد دیکھا۔ کسی کے لئے یہ غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ مجھے تقریب کی تفصیلات بتا رہے تھے۔ تقریریں ہوئیں۔ انعامات دیئے گئے

مگر میرے ذہن سے وہ چاکلیٹی مجسمہ نہ نکلا۔

میں نے مشن کے طور پر انڈسٹریل ہوم کھولنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ان خواتین کو آدھ گز کپڑے کا بلاؤز سینا سکھانے کا پروگرام وضع کیا۔ میرے اس مقصد کو حیرت سے سنا گیا مگر مقامی خواتین نے تعاون کرنے کا وعدہ کر لیا۔ مقامی خواتین سے باتیں کر کے میں نے اندازہ لگایا کہ بلاؤز کی طرف سے یہ بے نیازی محض غربت کا نتیجہ نہیں بیشتر خواتین سوئی دھاگے کا استعمال ہی نہیں جانتیں اور وہ زندگی کی ابتدائی ضروریات کو پورا کرنا ہی کافی سمجھتیں۔

بنگال میں رہ کر ملک کی ایک حقیقت اظہر من الشمس ہوئی اور وہ یہ کہ ہر بنگالی کو اپنی مادری زبان سے والہانہ عشق ہے۔ وہ اپنی زبان پر کسی دوسری زبان کی برتری کسی انداز سے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بنگال میں کامیاب زندگی گزارنے کا ایک ہی گُر ہے اور وہ یہ کہ بنگالی زبان پر عبور حاصل کر لو۔ ایک بنگالی کے ساتھ اس کی زبان میں بات کیجیے وہ فوری طور پر آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا ممکن ہے کہ بعد میں دوسرے حالات اور ذاتی مصلحت و اغراض اسے سوچنے پر مجبور کر دیں اور وہ آپ کی مخالفت کرے۔ مگر بنگالی بولنے سے جو فوری ردِ عمل ہو گا وہ آپ کے حق میں ہو گا۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ وہ بنگال جس میں ابتداً پاکستانی جذبہ ہر علاقہ سے زیادہ جوش و خروش سے تھا۔ وہ بعد میں غیر بنگالی پاکستانیوں کی طرف سے اس قدر مخالفت اور مفاہمت کا اظہار کیوں کرنے لگا تھا۔ وہ سوائے ایک خالص بنگالی کے اور کسی پاکستانی کو مشرقی پاکستانی ماننے کو کیوں تیار نہیں تھا؟ .... میں اسی نتیجہ پر پہنچی کہ غیر بنگالیوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے بنگالی زبان کو فوراً نہ اپنایا۔ اس کی ذمہ دار خاصی حد تک گورنمنٹ کی پالیسی بھی تھی۔ جس کے ذریعے اُردو کو برتری

کی حیثیت دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اگر کسی پالیسی کی بنیادیں محض اعلیٰ افکار پر رکھی جائیں اور جس علاقے کے لئے یہ پالیسی بنائی جائے اس کی فطری جبلتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ پالیسی دیرپا ثابت ہو ہی نہیں سکتی۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر اُردو مشرقی پاکستان کی قومی زبان نہ بن سکی اور وہ اردو دان جو قومی زبان کے بل بوتے پر مقامی زبان کو اپنانے سے گریزاں تھے، مار کھانے لگے۔ انہوں نے ابتدا میں مقامی تہذیب اور زبان سے دور رہنا چاہا۔ بعد میں مقامی علاقے نے انہیں قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اور پھر پاکستان کی دشمن قوتوں نے جذبات کے اس دھارے کو انجانے طریقے سے مخالف سمت میں موڑ دیا۔ یہ کتنا بڑا قومی المیہ تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ضرب ہماری بنیادیں ہلانے کے لئے کس قدر کاری تھی۔ مگر اس قدر استادانہ مہارت سے لگائی گئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کہاں سے کون وار کر گیا ؎

آنکھ پر ہوتا ہے جب ہر مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

پاکستان بننے کے بعد جو لوگ بنگال میں رہے وہ جانتے ہیں کہ بنگال میں پاکستان کے متعلق کتنا ولولہ تھا۔ مقامی باشندوں کا ان غیر بنگالیوں سے جو مغربی پاکستان یا بھارت کے دیگر علاقوں سے آکر بس گئے تھے بہت اچھا اور باعزت سلوک تھا۔ گو ان میں زیادہ میل جول نہ تھا۔ مگر اس کی وجہ مقامی باشندوں کی فطری جھجک تھی۔ کسی قسم کی نفرت یا دشمنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مقامی باشندے حتی الامکان بنگالی نہ جاننے والوں کے ساتھ اردو بولنے کی کوشش کرتے۔ بلکہ اردو بولنا خاندانی اور تعلیم یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ڈھاکہ کا نواب خاندان، بوگرا کے نوابان، سہروردی کے خاندان کے افراد اور لاتعداد دیگر قدیم اعلیٰ خاندانوں کے افراد نہ صرف اردو بولتے تھے بلکہ ان میں سے بعض اردو کے مستند عالم بھی تھے۔ ڈھاکہ

میں کبھی کسی اردو داں کو تکلیف نہ ہوتی تھی۔ ہر دکان دار اردو میں بات چیت کا مقصد سمجھ لیتا اور بیان کر لیتا۔ سرکٹ ہاؤس کے نوکر تو فخریہ اُردو بولا کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی سرکٹ ہاؤس کے ملازم سے میں نے بنگالی میں گفتگو کی، اس نے اُردو ہی میں جواب دیا۔ بلکہ مصر رہا کہ آپ بھی اُردو ہی بولیے۔

جذباتی طور پر جو خلیج اُردو اور بنگالی کے درمیان بنی وہ وسیع تر ہوتی گئی۔ میرے نزدیک اس کی دو ہی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ غیر بنگالی پاکستانیوں کا خود کو بنگالی زبان سے نابلد رکھنا یا مقامی زبان سیکھنے کی ضرورت کو اہمیت نہ دینا۔ دوسرے جذبات کی رو میں بہہ کر مقامی جبلتوں کو نظر انداز کر کے اُردو کو قومی زبان کی حیثیت سے بنگالی پر ٹھونسنے کی اندھا دھند کوشش۔

ان دونوں وجوہات کو برسر اقتدار حضرات نے کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر تصوّرِ پاکستان کے مخالفوں نے ان کی اہمیت کو خوب سمجھا۔ اور ان کو ترتیب سے بساط بنا کر ایسے مہرے چلے کہ بازی کا رخ ہی بدل دیا۔ شرم، اجنبیت اور نادانی نے جو بنگالی اور غیر بنگالی پاکستانیوں میں ایک حجاب سا حائل کیا تھا۔ اسے اس طرح ہوا دی کہ وہ ایک خلیج کی صورت اختیار کرتا چلا گیا اور جلد ہی نہ پاٹ سکنے کی حدود سے بھی نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کی آبادی تین ناموں میں منقسم ہو گئی۔ بنگالی، بہاری اور پنجابی۔ مقامی خالص آبادی نے تو بنگالی کا نام پایا۔ جس میں ساٹھ فیصد بنگالی بولنے والے مہاجرین بھی قابلِ قبول قرار پائے۔ غیر بنگالی صنعت کار، سرمایہ دار، تاجر اور اعلیٰ سرکاری افسروں نے پنجابی کا نام پایا اور باقی غیر بنگالی آبادی بہاری کے نام سے موسوم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ لفظ بہاری ایک گالی بن گیا اور اس طرح اس علاقے میں جہاں کمال جوش اور ولولہ سے پاکستان کے تصوّر کا خیر مقدم کیا گیا تھا وہاں تعصب اور فرقہ واری کا بیج بو دیا گیا۔ اصل کام تو بیج کا ہوشیاری اور مہارت

سے بونا ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو ذرا سی آبیاری سے تناور درخت ہو ہی جاتا ہے۔ ہمارے قومی المیے کا بیج بھی نہایت خاموشی سے بویا گیا تھا۔ ہمیں خبر اس وقت ہوئی جب اس تناور درخت کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ ان کو اکھاڑنا انسانی طاقت سے بعید تھا۔

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

بات جب چل نکلتی ہے تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ یہ سب لکھنے سے میرا مقصد سیاسی تجزیہ نہیں بلکہ میں صرف یہ لکھنا چاہتی تھی کہ بنگال میں کامیاب زندگی گزارنے کا پہلا گر وہی تھا کہ بنگالی زبان کو اپنا لیجئے اور اسی گر پر عمل کرتے ہوئے ہم نے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ بنگالی زبان سیکھ لی۔ میرے شوہر کو تو سال بھر پنڈت جی نے پڑھایا اور انہوں نے بہت جلد غیر بنگالی افسروں کے لئے منظور شدہ سارے بنگالی امتحانات پاس کر لئے۔ مگر میں نے صرف بولنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے بعد ہم نے بنگال میں رہ کر کسی بنگالی کے ساتھ کبھی اردو یا انگریزی میں بات چیت نہ کی اور یہی ہماری کامیاب زندگی کا اہم ترین راز تھا۔

تو میں عرض کر رہی تھی کہ ڈھاکہ کی سب ڈویژن مانک گنج میں پہنچ کر گھر کو ترتیب دینا شروع کیا تو چارپائیاں سب سے بڑا مسئلہ بن گئیں۔ فیملی میں ایک بچے کا اضافہ ہو چکا تھا اور ایک آیا کو بطور ملازم رکھ لیا تھا۔ ان دونوں کے لئے دو چارپائیوں کی ضرورت تھی جو کسی طور فراہم نہیں ہو رہی تھیں۔

بنگال کے نواحی علاقوں میں کوئی چارپائی استعمال نہیں کرتا۔ زمین پر چٹائی بچھا کر سوتے ہیں۔ یہ غربت کی نشانی نہیں بلکہ وہاں کا دستور ہے۔ میں نے جج صاحب اور سب ڈویژنل پولیس افسر کے گھر میں بھی بچوں کو نیچے چٹائی پر سوتے دیکھا۔ بعض لوگ

لکڑی کے تخت پر بھی سوتے تھے۔ البتہ شہروں میں کھاتے پیتے گھروں میں گدّے والے جدید پلنگ بھی استعمال کرنے کا رواج بڑھ رہا تھا۔ مگر بیشتر نواحی علاقوں کے بچانوے فیصد لوگ زمین پر چٹائی بچھا کر ہی سوتے تھے۔

تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ وہ علاقہ جہاں دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتی ہے جو بانس کے جنگلات سے بھرا پڑا ہے وہاں کے لوگ زمین پر سوئیں۔ یعنی اس میں مشکل کیا ہے، کسی طور چار بانس جوڑ کر لکڑی کے چار پائے بنوا کر پٹ سن سے بُن لیا۔ لیجئے چارپائی تیار ہے۔ میں نے یہ سوال اپنی ایک ڈھاکہ کی دوست سے کیا جو ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں۔ انہوں نے جو جواز پیش کیا وہ بہت قرین قیاس تھا۔ کہنے لگی "قدرت ہم لوگوں پر بے حد فیاض ہے۔ ہمارے دیہاتی کو گھر بیٹھے کھانا مل جاتا ہے۔ اسے دھوپ میں ہل چلانا نہیں پڑتا۔ وہ گھر کے سامنے ایسے ہی دھان پھینک دے تو اسے بھات کے لئے چاول مل جاتے ہیں اور گھر کے سامنے تالاب یا قریب کی ندی سے جا کر مچھلی پکڑ لاتا ہے اور ماچھ بھات ہی بنگالی کا پسندیدہ کھانا ہے۔ جو زیادہ محنت کے بغیر ہی اسے مل جاتا ہے۔ قدرت کی اسی بے انداز فیاضی نے اسے سہل پسند بنا دیا ہے۔ وہ زندگی گزارنے کے لئے خود کو کم از کم تکلیف دینا چاہتا ہے۔" میری دوست نے یہاں تک کہا کہ "اگر ہمارے دیہاتی کے پاس دو دن کا بھات ہے تو وہ آج کام کرنے نہیں جائے گا۔" خیر اس بیان سے تو بہت مبالغہ لگتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ سہل پسند واقع ہوئے تھے۔

تو دو چارپائیاں فراہم کرنا ایک مسئلہ لاینحل بن گیا۔ ڈھاکہ سے پلنگ منگوانے میں بہت زیادہ وقت اور روپے کی ضرورت تھی۔ جس کے لئے میں تیار نہ تھی۔ آخر گھر کا جمعدار آڑے آیا۔ وہ پورب سے بیس پچیس سال قبل یہاں آ کر بس گیا تھا۔ اس کی مدد سے میں نے بمشکل تمام الٹی سیدھی ایک چارپائی بنائی۔ ایک تخت منگوا لیا گیا۔

کام چل گیا۔ گھر ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ اس ساری کارروائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ جمعدار کی بیٹی بدھوا ہماری دوست بن گئی اور وقتاً فوقتاً اپنی رائے سے نوازنے آموجود ہوتی اور خود کو ہر بات پر مستند سمجھتی۔ یوں ہماری روزمرہ کی زندگی اپنے معمول پر آگئی۔

بنگال کی مرطوب آب و ہوا میں صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر روز باقاعدگی سے ورزش کرنا اور خود کو مستعد اور سرگرم عمل رکھنا بہت ضروری ہے۔ صبح کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر میں اپنے شوہر کے ساتھ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کلب میں چلی جاتی تھی وہاں پنگ پانگ کی دو تین گیمیں کھیلیں۔ واپس آکر میرے شوہر دفتر کے لئے تیار ہو جاتے اور میں گھر اور بچوں میں مصروف ہو جاتی۔ شام کو پھر کلب میں چلے جاتے اور پھر پنگ پانگ کھیلتے۔ پھر کبھی برج بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن اس میں جو آڈانگہ کی سی باقاعدگی نہ تھی۔ خراب موسم اور بارش کے باعث تفریح کی انتہا کلب کی ہی چھوٹی سی عمارت تھی۔ کوئی آؤٹ ڈور گیم تو ممکن ہی نہ تھی۔ البتہ برج کے کھلاڑی بہت تھے اور بہت عمدہ، وہاں برج کو شوق اور ذہانت سے کھیلتے دیکھا۔ ابھی تک ان لوگوں نے مغربی پاکستان کی طرح اس کھیل کو ایک جوا یا افسرانِ بالا کو جیتنے کا موقع فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے تالابوں کے اس پار بہت سے سرکاری افسروں کے گھر تھے۔ ہم لوگ سب کے یہاں ایک ایک مرتبہ ملاقات کی غرض سے گئے۔ مگر ان میں سے ایک دو کے علاوہ کسی کے گھر کی خواتین میرے پاس نہ آئیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھ سے اجنبیت کے باعث یہ لوگ نہیں ملتے۔ مگر بعد میں جب بعض خواتین سے رسم و راہ بڑھائی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آپس میں بھی ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتیں۔ اس بیگانگی کی وجہ ان کی فطری شرم و جھجک اور موسم تھا۔

مانک گنج میں شروع شروع میں مجھے شوہر کے ساتھ دورے پر جانے میں بہت

لطف آتا تھا۔ یوں لگتا جیسے ایک طویل پکنک پر جا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تھانوں اور تحصیلوں میں جیپ یا موٹر پر جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ تین بڑی بڑی کشتیوں کا انتظام ہوتا۔ یہ کشتیاں کسی طرح ہاؤس بوٹ کا کام دیتیں۔ ایک کشتی کے درمیان میں کپڑے کا پردہ باندھ کر ایک طرف سونے کے لئے بستر لگائے جاتے، اور دوسری طرف فرش بچھا کر بیٹھنے کا انتظام ہو جاتا۔ اسی سٹنگ روم میں دورے پر ساتھ جانے والے افسران آجاتے۔ یہاں ہی دفتر کا کام کیا جاتا اور یہاں ہی بیٹھ کر برج جمتی۔ دوسری کشتی دورے پر ساتھ جانے والے عملے کے لئے مخصوص ہوتی اور تیسری کشتی باورچی خانہ کے طور پر استعمال کی جاتی۔ یہ تینوں کشتیاں ایک دوسرے کے پیچھے پا باندھ کر ساتھ ساتھ چلتیں۔ اس ٹھاٹھ سے ہم دورہ پر نکلتے۔ بلہاٹی کا دورہ تو مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

بلہاٹی جانے کے لئے ہم لوگ صبح ہی گھاٹ پر پہنچے۔ سامان ہماری کشتی میں رکھا جا چکا تھا۔ دوسری کشتی پر ایس ڈی پی او، اور سرکل آفیسر (وہاں تحصیل دار کو سرکل آفیسر کہتے ہیں) تھے۔ اور تیسری میں ہمارے خانساماں حبیب صاحب، کھانے کے برتنوں اور جنس کے ساتھ موجود تھے۔ چونکہ پورا دن سفر کرنا تھا اور ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ اس لئے سب کا کھانا ساتھ ساتھ بنتا تھا۔ لہٰذا آٹا، چاول، گھی، مرچ، مصالحے مرغی، سبزی، ہر چیز کافی تعداد میں ساتھ لے کر آئی تھی۔ البتہ مچھلی کا یہ طے پایا کہ راستہ میں تازہ خرید لی جائے گی۔ ملازموں کے لئے علیحدہ موٹا چاول بھی ساتھ تھا۔ بنگالی باسمتی خوشی سے نہیں کھاتے۔ مچھلی کے شوربے کے ساتھ موٹا چاول ہی من بھاتا کھاجا ہے

تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دوسری کشتی برابر آگئی اور سرکاری افسران جو ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری کشتی میں آگئے۔ میں اور بچے کشتی کے پچھلے حصے میں چلے گئے اور سامنے والے حصے میں باقاعدگی سے دفتر جما لیا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب تیسری کشتی بھی برابر

آگئی اور ملازم چائے لے کر آگیا۔ دو بجے کے قریب دفتری کارروائی بند ہوئی اور وہاں پر ہی دستر خوان بچھ گیا اور سب نے مل کر کھانا کھا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد باقی افسران اپنی کشتی پر چلے گئے اور ہم لوگ بستروں پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئے۔ چار بجے بھی اسی طرح چائے پی گئی اور وہیں برج کی بازی جم گئی۔

ندی کے دونوں طرف ہریاول، جمع شدہ پانی اور پٹ سن کے اونچے اونچے کھیتوں کی وجہ سے مچھر اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ جونہی کشتی کسی کام کے لئے رکتی یا ذرا ہوا کم ہوتی تو طبیعت صاف کر دیتے۔ اتنے تندرست اور موٹے مچھر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھے۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں لوگ صرف دھوتی باندھے ہوئے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ پٹ سن کی کہیں کہیں کٹائی ہو چکی تھی اور اسے ندی میں چھلنے کے لئے ڈال دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ بہاؤ کے ساتھ بہہ نہ سکے اور پانی اس کا چھلکا علیحدہ کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ پٹ سن پانی میں سڑ کر عجیب قسم کی بُو پیدا کرتی ہے۔ دُور سے ہی یہ بدبو اعلان کرتی ہے کہ اس علاقہ کی پٹ سن کٹ چکی ہے پانی میں جگہ جگہ لمبی گھاس بھی ہوتی ہے جس کے اوپر سے ہماری کشتی سر سر کرتی ہوئی نکل جاتی۔ کشتی جب ہوا کے رخ پر چلتی تو کشتی کا بادبان کھول دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے رفتار تیز ہو جاتی اور جب ہوا کے مخالف سمت میں جانا ہوتا تو ملاح کشتی کو کنارہ پر لے جاتا اور ایک لمبی ڈور کو پکڑ کر خود کشتی کو کھینچتا۔ دوسرا ملاح کشتی میں بیٹھ کر اس کے رُخ کو سیدھا کرتا۔ اس طرح یہ سفر طے ہو رہا تھا۔

جب بلہاٹ پہنچے تو شام کا دھندلکا چاروں طرف چھا رہا تھا۔ کنارے پر کئی حضرات ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ میں تمام دن کشتی میں بیٹھ کر اس قدر عاجز آ چکی تھی کہ مجھے کسی چیز میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ چند فرلانگ چل کر ایک ایسے علاقہ میں آئے جہاں کی ہر عمارت سے رئیسانہ ٹھاٹھ ہویدا تھے۔ اسی طرح کی ایک محل نما

عمارت میں ہم داخل ہوئے۔ عمارت اپنے بیش قیمت فرنیچر اور قیمتی سامان آرائش کے ساتھ خالی پڑی تھی۔ ہم اوپر کی منزل میں آگئے۔ سونے والے کمرے میں قالین اور بیش قیمت پلنگ دیگر آرائشی سامان کے ساتھ سلیقے سے سجائے ہوئے تھے۔ میں اتنی تھک چکی تھی کہ بچوں کو جلدی سے سلا کر گرد وپیش کا جائزہ لئے بغیر سو گئی۔

صبح اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مانک گنج سب ڈویژن کا ذیلی علاقہ، مگر خدا کی شان نظر آئی۔ کہاں مانک گنج کے لوگوں کے غربت وعسرت میں بنے ہوئے کچے مکانات اور کہاں یہ محل نما عالیشان عمارات، کھڑکی کے باہر نظر ڈالی تو سامنے کئی دومنزلہ عمارات تکبّر سے سر اٹھائے اپنے مالکوں کی دولت کی غمازی کر رہی تھیں۔ ہر عمارت انیسویں صدی کے ہندوانہ فن تعمیر کا شاہکار تھی۔ سامنے چھتوں پر مختلف قسم کے اصنام نصب تھے۔ مرکزی دروازوں پر یا تو پتھروں کے شیروں کی جوڑی بیٹھی ہوئی تھی یا خوبصورت پتھر کے بُت نصب کر دیئے گئے تھے۔ چاروں طرف ناداری اور غربت کے گہرے سمندر میں دولت وثروت کا یہ جزیرہ عجیب سا لگا ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے

معلوم ہوا کہ یہ ہندو زمینداروں اور جاگیرداروں کی ایک بستی ہے۔ جس عمارت میں ہم ٹھہرے تھے، اسے وہاں کے زمیندار نے مہمان خانہ کے طور پر بنوایا تھا۔ سامنے زمیندار کی اپنی نہایت شاندار رہائش گاہ تھی اور ان دونوں عمارتوں کے بالمقابل ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ خشکی سے پانی تک نہایت خوبصورت سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ تالاب کے بائیں طرف عین پانی کے اوپر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ جہاں خواتین کے غسل کا انتظام تھا۔ پانی کے اندر کچھ تھوڑی دور پُل سا بنا کر چبوترے سے بنا دیئے گئے تھے۔ جو شام کو بیٹھنے کی نہایت عمدہ آرام گاہ کے علاوہ دن میں مچھلی کے شکار کے لئے اچھی جگہ تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر میرے ذہن میں انگریز کی مسلم دشمنی کا

ایک واضح تصوّر نمودار ہوا کہ جس نے پہلے مسلمانوں کو "مستقل زرعی آبادکاری" کے ذریعہ غلام در غلام بنایا۔ اس لیے کہ اس بندوبست کی وجہ سے کاشت کار (جوکہ عام طور پر مسلمان تھے) اور سرکار برطانیہ کے عملداروں کے درمیان سینکڑوں درمیان کے لوگ پیدا ہوگئے جو ان کاشتکاروں پر جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ ۱۹۰۰ء کے قریب "سن سیٹ لا" بنایا گیا۔ جس کی زد میں وہ معافیاں بھی آ گئیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھیں اور جو کہ مقررّہ تاریخ پر سورج غروب ہونے کے بعد عدم ادائیگی کی صورت میں فروخت کی اہل قرار دی گئیں۔ دس سال کے عرصہ میں یعنی ۱۹۱۰ء تک مسلمان زمیندار تباہ ہو گیا اور اس کی معاشی لاش پر انگریز کی معاونت سے ایک نیا نظام تعمیر کیا گیا۔ بلہاٹی اسی نظام کا ایک چمکتا ہوا ستارہ تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان کو اتنا لاغر اور پریشان کر دو کہ پھر سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان نہ پیدا کر سکیں۔

ہاں تو ملحقہ علاقے کے سرکل آفیسر جو ہمارے ہمراہ تھے ان کا نام رقیب الدین احمد تھا۔ بہت ذہین اور دلچسپ گفتگو کرتے۔ انہوں نے ہی مجھے مچھلی کا شکار کھیل کر دن گزارنے کی مفید ترغیب دی۔ وہ خود چونکہ مچھلی کے شکار کے شوقین تھے۔ لہٰذا کانٹا، ڈور اور پھر کی ساتھ لے کر آئے تھے۔ جب میرے شوہر علاقے کے مسائل کا جائزہ لینے اور دیگر سرکاری کام کرنے کے لیے وہاں کے مقامی لوگوں اور سرکاری عملہ کے ساتھ چلے گئے، تو میں اور خوندکر رقیب الدین اپنا تام جھام لے کر تالاب کے چبوتروں پر براجمان ہوئے۔

پتلے سے دھاگے کی ڈور اور کلنٹے کے ساتھ روہو مچھلی کا شکار بہت مہارت طلب کھیل ہے۔ چونکہ بنگالی ہندو مچھلی کا گوشت کھاتے ہیں۔ لہٰذا اس تالاب میں مچھلیاں خاص طریقے سے پالی گئی تھیں اور اکثر مچھلیاں بہت بڑی تھیں۔ پہلی

مرتبہ دھاگہ ہلا۔ یہ اس بات کی نشان دہی کرتا تھا کہ مچھلی نے کانٹا منہ میں لے لیا ہے۔ میں نے جوں ہی پھرکی چلا کر مچھلی کو اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ پتلی سی ڈور ٹوٹ کر پانی کی سطح پر آگئی اور مچھلی کانٹے سمیت تالاب میں ہی رہ گئی۔ دوسری مرتبہ جو دھاگہ ہلا تو رقیب الدین نے پھرکی خود تھام لی اور پھر جو میں نے اس کی مہارت دیکھی تو محو حیرت رہ گئی۔ کوئی آدھا گھنٹہ وہ مچھلی کو تڑپاتا رہا۔ بالکل آہستہ آہستہ ڈور کو اپنی طرف کھینچتا اور جب مچھلی زور لگاتی تو وہ ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیتا اور مچھلی بھاگ کر دور چلی جاتی۔ بار بار یہی عمل دہرایا۔ جب اس نے مچھلی نکالی تو وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ اس میں ڈور کھینچنے کی سکت ہی باقی نہ رہی تھی۔ خوندکر رقیب الدین خود بھی قانون دان تھا اور اس کے بھائی خوندکر مشتاق جو عوامی لیگ کے ایک نمایاں لیڈر تھے وہ بھی ڈھاکہ میں وکالت کرتے تھے (یہی خوندکر مشتاق احمد ہیں جو مجیب الرحمٰن کے قتل کے بعد تھوڑے عرصہ صدر رہے ہیں، اور آج کل بنگلہ دیش کی بہت بااثر شخصیت ہیں) اسی شکار کے دوران اس نے مجھے قانون پڑھنے کی ترغیب دی اور اپنے بھائی سے قانون کی کتابیں لا کر دینے کا وعدہ کیا۔ اس کی باتوں نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ بعد ازاں میں نے نہ صرف قانون کی تعلیم حاصل کی بلکہ قانون کے امتحان میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کر کے قانون پڑھانے کی استاد مقرر ہوئی۔

دوسرے روز چند مقامات دیکھنے کے لئے میرے شوہر مجھے بھی ساتھ لے گئے ایک چیز جو میں نے ہر جگہ نوٹ کی وہ یہ تھی کہ نہ صرف ہندو تہذیب و تمدّن پورے علاقہ پر چھایا ہوا تھا۔ بلکہ پوری معیشت تقریباً مکمل طور پر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ یہاں تک ہی مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ مسلمان مجموعی طور پر ایک گھٹیا صنف بن کر رہ گئے تھے محض اچھوت یا کمتر جنس۔ ابھی کل کی بات تھی کہ ان میں ہمّت نہیں تھی کہ وہ اپنے ہندو آقاؤں کے سامنے بیٹھ جائیں یا بات کرنے کے لئے مُنہ کھولیں۔ اگرچہ تقسیم کے بعد بہت بڑا تغیّر رونما ہوا اور حالات اب تیزی سے بدل

رہے تھے۔ لیکن اب بھی ہندو کی ذہنی، تہذیبی اور معاشی برتری روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ یہ بات اس مثال سے واضح ہو جاتی ہے کہ میں نے اس صورتحال کے متعلق ایک ہندو سے دریافت کیا تو اس نے تسلیم کیا کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی حیثیت اچھوتوں جیسی ہے۔ میں نے اس پر شدید احتجاج کیا تو انہوں نے ایک مقامی مسلمان کو بلا کر وہاں بیٹھنے کی پیش کش کی۔ مگر وہ اس قدر جھجک رہا تھا، جیسے یہ کوئی انہونی بات ہو اور وہ کسی طرح بیٹھنے کو تیار نہ ہوا۔ یہ علاقہ اسی مملکت پاک کا ایک حصہ تھا۔ جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ جس میں مسلمانوں کو بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل تھا۔ اللہ وغنی ۔۔۔ اپنے وطن عزیز میں مسلمانوں کی یہ تذلیل دیکھ کر میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ میں اس شخص کے پاس گئی جو خود کو مسلمان کہتا تھا، اور اس سے نام پوچھا۔ ایک مسلمان جیسا ہی کچھ نام لیا۔ میں نے نماز اور قرآنِ پاک کے متعلق پوچھا تو وہ خالی خالی نظروں سے مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی بہت عجیب بات پوچھی ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ اسے کلمۂ طیب بھی نہ آتا تھا۔ یا میرے پروردگار یہ کس قسم کا مسلمان ہے اگر اس قدر جاہل ہے تو خود کو مسلمان کیوں کہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی مذہب سے یکسر ناواقفیت کا ذمہ دار کسے ٹھہراؤں۔ ان مذہبی مبلغوں کو جو غیر ممالک میں تو جا سکتے ہیں مگر اپنے دور افتادہ مقامات پر جا کر اسلام کی روشنی پھیلانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے یا ہندو تہذیب کے اس غلبے کو جس نے انکو انسان کی بجائے کولہو کا بیل بنا دیا تھا۔ ؎

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

بلہاڑی کا دورہ خاصے تلخ مشاہدات لئے ہوئے ختم ہوا۔ اور ہم اسی طرح کشتیوں میں بیٹھ کر واپس لوٹے۔ راستہ میں میرے شوہر نے تھانہ گھبور کا بھی معائنہ کرنا تھا

لہٰذا دریا کے عین کنارے گھیور کی بستی سے کچھ دُور ہماری کشتیاں لنگر انداز ہوئیں ٹین کی چھتوں اور بانس کی چٹائیوں کی دیواروں کے مکانات پر مشتمل یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ یہاں پر لڑکیوں کا ہائی سکول اور لڑکوں کا ایک کالج بھی تھا۔ یہ تمام ادارے پرائیویٹ تھے۔ جنہیں ہندو حضرات چلا رہے تھے۔ ہم لوگ بھی سیمنٹ کے چبوترے پر اسی طرح کے بانس اور ٹین کے بنے ہوئے ایک کمرے کے مکان میں چلے گئے۔ سونے کے لئے لکڑی کے تخت بچھے ہوئے تھے اور کونے میں ایک معمولی سی میز اور اس کے گرد چار لکڑی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ شام کے قریب ایک مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر آ گئے۔ وہ ہماری میزبانی اور تواضع کے طور پر نغمہ اور موسیقی کی ایک تقریب منعقد کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہمارے اسی کمرے میں گیس کی روشنی میں سب مقامی فنکار آ گئے۔ یوں تو کئی گانے گائے گئے۔ مگر ایک لڑکی نے جو مقامی سکول کے درجہ دہم کی طالبہ تھی بہت اچھے اُردو گیت سنائے۔ ہیڈ ماسٹر کے بقول وہ ایک نالائق طالبہ تھی۔ مگر گاتی خوب تھی۔ اس کا اردو تلفظ بہت غلط تھا۔ مثلاً ایک گانا وہ یوں گا رہی تھی۔ "اے ڈریا کے مشت کناڑو، جھلمل کرتے چاند شتاڑو..." مگر پھر بھی لطف آ رہا تھا۔ ایک نوعمر فن کار نے جلترنگ بجایا۔ ایسا جلترنگ عمر میں کبھی نہیں سنا تھا۔ ننھے ننھے چینی کے پیالوں میں ایک خاص سطح تک پانی بھر کر ایک قطار میں رکھ دیا گیا تھا اور دو ننھی ننھی چھڑیوں سے انہیں اس طرح بجا رہا تھا کہ پوری فضا میں نغمہ کا جادو چھا گیا اور ہم مسحور اور بے خود ہوئے اسے سن رہے تھے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

جلترنگ کی موسیقی ختم ہوئی تو ایسے لگا جیسے یک دم فلک سے خاک پر کسی نے ٹپک دیا ہو۔ اس فن پارے کے بعد اور کچھ سننے کو جی نہیں چاہا اور ہم لوگ جلترنگ کا

سحر انگیز تاثر ذہن میں لئے سو گئے۔

دوسری صبح جو باہر نکلی تو دریا کا کنارہ زندگی سے ہمک رہا تھا۔ بے شمار بڑی بڑی کشتیاں رنگ برنگے جھنڈے لہراتی ہوئی لنگر انداز تھیں۔ سامان اتارا جا رہا تھا۔ عجیب اجنبی صدائیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ہاٹ (دیہات کی بازار) کا دِن تھا۔ ہر طرف رونق اور گہما گہمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور چاروں اطراف سے مختلف النوع سامان سے بھری ہوئی کشتیوں نے رات ہی کو آنا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی اور کچھ دیر کے بعد گرمیٔ بازار قابل دید تھی۔ اس علاقہ کا سب سے بڑا "ہاٹ" اس دن ہر ہفتے وہاں لگتا تھا۔ وہ بھی دلچسپ منظر تھا وہاں کشتیوں میں بازار کی مانند ایک خاص ترتیب سے خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ کشتیوں کا کچھ بہتا ہوا اور کچھ کنارے پر لگا ہوا یہ بازار عجیب سا لگ رہا تھا۔ قبل اس کے کہ دن زیادہ چڑھے ہم لوگ اس پُر رونق بستی کو چھوڑ کر واپس مانگ گنج آنے کے لئے پھر اپنی کشتیوں میں بیٹھ گئے۔

مانک گنج میں گرمی عروج پر تھی۔ ابھی مون سون کا موسم شروع ہی ہوا تھا۔ ہاتھ سے چلانے والا چھت کا پنکھا دوپہر کو چلتا اور رات کو ہم اپنے جالی دار برآمدے میں سوتے۔ پنکھا چلانے والا منحنی سا چھوٹے قد کا چپراسی بھی دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی ڈیوٹی دوپہر کو تین چار گھنٹے تھی جو عموماً پنکھے کی رسّی ہاتھ میں لے کر سو کر گزار دیتا اگر بہت تاکید کی جاتی تو وہ اپنے پیلے پیلے باہر نکلے ہوئے دانت مزید باہر نکال کر ہنس دیتا۔ اتنا کمزور اور لاغر شخص تھا کہ مجھے ترس آنے لگتا۔ ایک روز صبح سویرے حسب معمول دانت باہر نکالے ہوئے آیا اور آتے ہی جسم کو کئی بل دے کر شرماتے ہوئے سر کو جھکا کر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے بولا۔ "پھیلے ہوئے چھے" میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ رہا ہے اور اس قدر خوشی کی وجہ کیا ہے۔ دوسرے ملازموں

نے بتایا کہ اس کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ میرا قیاس یہ تھا کہ شاید پہلا بیٹا ہوا ہے۔ لہٰذا بہت مبارک دی۔ مگر جب اس نے بتایا کہ وہ اس کا آٹھواں بچہ ہے تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ ایسی معیشت میں ایسی خوشیاں —! یہ ہی حالات انسانیت کی قدروں سے دور انسان کو کیڑے پتنگے کی طرح بے حقیقت شے بنا دیتے ہیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے جو مسجودِ ملائیک قرار پایا۔ وہی انسان بھیڑ بکری سے بھی سستی جنس بن جاتا ہے۔ ایسی بلندی اور پھر یہ پستی۔ قدرت کے اصول بھی نیارے ہیں۔

ایک روز گرمی سے جان پہلے ہی ذبح ہو رہی تھی۔ اوپر سے میرے شوہر پریشان سے گھر آئے۔ دراصل نیوگی کے متعلق رپورٹ آئی تھی کہ وہ غیر قانونی کاروبار چلاتے ہیں۔ یعنی وہ ہندو جو پاکستان چھوڑ کر بھارت چلے جا رہے تھے یا چلے گئے تھے۔ ان سے پچھلی تاریخوں میں پاور آف اٹارنی لے کر ایک ہندو کی جائیداد کو چپکے چپکے کئی مسلمانوں کے پاس بیچتے ہیں (بیچارے بھولے مسلمان باہر تو لٹتے ہیں ہی، اپنے ملک میں بھی ان کی سادگی اور نادانی کس کس طرح انہیں زک پہنچاتی ہے) مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ علاقے کی تہذیب و تمدن کا علمبردار ایسا جعلساز بھی ہو سکتا ہے؟ مگر دوسرے روز مکمل رازداری کے ساتھ جو چھاپہ مارا گیا تو اس کے کمرے سے تمام کاغذات کے علاوہ اس کی ڈائری بھی برآمد ہوئی جو اس کی جعلسازیوں کی مکمل شاہد تھی۔ یہ شخص ہنڈیوں کے ذریعے ہندوؤں کو بھارت روپیہ بھیجتا تھا اور پاکستان میں ہندوؤں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ یہ شخص جو بظاہر پاکستان کا ایک نہایت معزز شہری تھا، خوش لباس اور نہایت شیریں گفتار جو علاقے کی ہر تنظیم کا سربراہ تھا۔ دراصل شرافت کے لبادے میں ایک گھناؤنا غدار انسان نکلا، جو وطن عزیز کی بنیادوں کو اپنے امکان بھر کھرچ رہا تھا۔ اس کی غداری کے تمام ثبوت مہیا ہو چکے تھے لیکن چونکہ وہ بہت اہم اور با اثر آدمی تھا۔ لہٰذا میرے شوہر

نے نہ صرف اس کی گرفتاری کے آرڈر دیئے۔ بلکہ خود اپنے سامنے ہتھکڑی لگوا کر اسے گرفتار کروایا۔ مگر اس گرفتاری کی خبر ڈھاکہ کے ہندو وزراء میں بم کی طرح پھٹی لہٰذا بہت کھلبلاہٹ مچی۔ اس کے جرم کے ثبوت اس قدر مکمل تھے کہ قانوناً اس کا بچنا ناممکن تھا۔ مگر یہ حقیقت بھی روشن تھی کہ میرے شوہر شیر کے بھٹ میں ہاتھ ڈال چکے تھے اور اس سے بالکل صحیح سلامت بچ نکلنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ اس کارروائی کا ردِّ عمل گورنمنٹ کی سطح پر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے پسند بھی کیا جا سکتا تھا، اور میرے شوہر عتاب کی زد میں بھی آ سکتے تھے۔ مگر اس وقت جب دروازہ کی اوٹ سے مسٹر نیوگی کو بکفِ پولیس کے جلو میں گزرتے دیکھا تو ہر شے کی بے ثباتی پر ایمان تازہ ہو گیا۔ میرے جسم پر جذبات کی شدّت اور خوف نے سنسناہٹ طاری کر دی، واقعی

وَ تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ

تالابوں کے اس پار جو جج صاحب رہتے تھے وہ بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے اور چٹاگانگ ہل ٹریکٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام پسُم مُدام دھام تھا۔ میں انہیں مسٹر ڈھام ڈھام ہی کہتی تھی۔ اپنی ایک بیٹی اور بیگم کے ہمراہ بہت خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم لوگ کبھی کبھار ان کے گھر چلے جاتے۔ جولائی کے آغاز ہی میں مون سون کا موسم جوبن پر آ گیا تھا۔ بارشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس شام بادل جو ذرا چھٹے تو ہم لوگوں نے کہیں باہر جانے کا سوچا۔ ملّا کی دوڑ مسجد تک، گھر سے اٹھے اور پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جج صاحب کے گھر چل دیے۔ برآمدے میں کرسیاں بچھائے ہم سب باتیں کر رہے تھے کہ عجیب خوفناک سا شور بلند ہوا۔ چند لمحے تو یوں لگا کہ بہت بڑی کوئی آسمانی آفت، ناگہانی طور پر آ رہی ہے۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے بڑے بڑے اژدہے مل کر خوفناک طور پر پھنکار رہے ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یوں جیسے قیامت آ رہی ہو اور زمین و آسمان ٹکرانا

ہی چاہ رہے ہوں۔ اس قدر شور تھا کہ خدا کی پناہ۔ سامنے دیکھا تو کچھ دور ایک چار فٹ قطر کا بڑا اژدہا واقعی پھنکارتا چلا آرہا ہے۔ خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جج صاحب کے چہرے پر پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔ غالباً وہ میرے خوف سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اطمینان سے بولے: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ پانی چلا آرہا ہے"! میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ میرے مالک! یہ پانی ہے یا عذاب الہٰی۔ خوفزدہ بچے کی طرح بے تحاشا روتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "یہ پانی آخر جائے گا کہاں؟"۔ جج صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی سب ہی ہنس رہے تھے۔ "پہلے آپ کے تالابوں کو بھرے گا اور پھر تمام علاقے میں پھیل جائے گا۔" انہوں نے جواب دیا۔ معلوم ہوا کہ مانک گنج سطح سمندر سے نیچے ہے لہٰذا اردگرد کے علاقوں کا پانی سمندر کی جانب جانے کی بجائے یہاں ہی جمع ہو جاتا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ میں ان کی ہنسی کا سامان فراہم کر رہی ہوں مگر جب اور موت اور زندگی گلے ملتی نظر آئیں تو تمکنت اور وقار، جھوٹی اور بے حقیقت شے بن جاتی ہے۔ میں وہاں سے روتی ہوئی اٹھی اور کسی طرح گھر پہنچی۔ میرے شوہر مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر یہ طفل تسلیاں بے کار ثابت ہوئیں۔ مجھے اس لمحے اپنا اعصابی نظام ختم ہوتا محسوس ہوا۔ اس صورتحال سے متاثر ہو کر میرے شوہر نے دورے کا پروگرام بنا لیا اور ڈھاکہ سے "اسٹیلا" نامی لانچ منگوانے کے لئے ڈپٹی کمشنر ڈھاکہ کو اطلاع دی۔

اگلے دن شام کے وقت میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیزار صورت بنائے بیٹھی تھی کہ یک دم ایک مانوس سی سلام کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ممتاز بھائی ایک لڑکے کے سر پر سامان اٹھوائے چلے آرہے تھے۔ میرے شوہر ایک نعرہ لگا کر ممتاز سے لپٹ گئے۔ وہ سخت جھنجلائے ہوئے بولے "ارے یار! کہاں خدا گنج کے پچھواڑے آبسے ہو۔ یعنی نامعقولیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے —"

ونگ کمانڈر ممتاز مرزا ہمارے بہت عزیز دوست بلکہ بھائی ہیں - جب وہ ڈھاکہ ایرپورٹ پر صبح چھ بجے اترے تو معلوم ہوا کہ مانک گنج ڈھاکہ سے قریب ہی ہے . سوچا کہ ناشتہ گھر ہی جاکر کریں گے اور نہار منہ لانچ پر سوار ہو گئے۔ ایک بجے کے قریب آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں تو پوچھا کہ منزل کتنی دور ہے . سارنگ نے جواب دیا قریباً آدھا راستہ طے ہو گیا ہے .... خوب جھنجلائے - مانک گنج گھاٹ سے پتلی پگڈنڈی پر جس کے دونوں طرف پانی بھرا ہوا تھا - احتیاط سے چلتے ہوئے جب گھر پہنچے تو سخت لڑنے کے موڈ میں تھے - مگر میرے لئے اس اذیت ناک ماحول میں ان کی آمد ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح تھی جو کہیں سے آکر حبس اور گھٹن کی فضا کو خوش گوار بنا دیتا ہے ۔

"اسٹیلا" آگئی اور میرے شوہر ہم سب کو لے کر دورے پر روانہ ہوئے ، ایک خوبصورت سبک سی لانچ نے فضا کو جیسے حسن بخش دیا ہو- وہ پانی جو میرے لئے رنج و محن کو جنم دے رہا تھا - یکدم رومان پرور بن گیا - ورڈز ورتھ کا کہنا کہ قدرت کو حسن ہماری اپنی نظر اور ذات بخشتی ہے . واقعی صحیح معلوم ہوا - ممتاز بھائی بھی خوب لطف اندوز ہو رہے تھے اور ہمارے لئے تو ان کی رفاقت اور معیت ایک نعمتِ خداداد تھی ۔

ڈھاکہ کے راستہ میں دو جگہ معائنہ کے لئے میرے شوہر کو رکنا تھا - چنانچہ دن میں تو وہ خشکی پر سرکاری کام کے لئے چلے گئے اور شام کو ہماری تواضع کے لئے حسبِ دستور مقامی فنکار لانچ پر ہی آگئے - اوپر ڈیک پر کرسیاں بچھا لی گئیں اور وہیں محفلِ موسیقی جمی ۔

وہ شب بھی یادوں کے خزانہ کا ایک بیش قیمت سرمایہ بن گئی ہے . مون سون کا موسم ہونے کے باوجود اس رات نیلگوں آسمان بالکل صاف تھا - چودھویں کا چاند

اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ فگن تھا۔ دریا کے پانی پر جیسے دُور دُور تک چاندی کی مسحور کن چادر بچھ رہی تھی۔ اس ماحول کی سحر انگیزی کو وہی محسوس کر سکتا ہے۔ جس نے دریا پر چاندنی کا لطف اٹھایا ہو۔ عجیب ماورائی فضا ہو رہی تھی۔ گو خلافِ معمول کوئی بھی فنکار ڈھنگ کا نہ تھا۔ نہ بول سمجھ میں آرہے تھے اور نہ راگنی۔ پھر بھی موسیقی اپنا طلسم پوری طرح پھیلا رہی تھی اور ہم اس طلسم کے حصار میں رات گئے تک سحر زدہ بیٹھے رہے۔

دوسرے روز صبح ڈھاکہ پہنچے۔ ان دنوں ڈھاکہ لندن سے کم نہیں لگتا تھا۔ بجلی اور اس کی تمام آسائشیں، غسلخانوں میں ہر وقت صاف پانی اور آمد و رفت کے لئے کار یا رکشا اور اس پر مزید طرۂ یہ کہ اگر سیر کو جائیں تو سڑکیں موجود۔ شیخ سعدیؒ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو سرما کی صعوبتیں برداشت نہ کرے وہ بہار کی لطافتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ واقعی موجودہ سہولتوں اور آسائشوں کی قدر اسی کو ہوتی ہے جو ان کے بغیر زندگی کی دشواریوں سے نبرد آزما ہو رہا ہو۔ شہریوں کے مکیں شاید یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ سڑکیں جنہیں عام حالات میں قابل غور شے نہیں سمجھتے کتنی بڑی نعمت ہیں باقی آسائشوں کا تو ذکر ہی کیا۔ مگر ہمارا ڈھاکہ میں ایک روز کا مختصر اور عارضی دورہ تھا۔ ممتاز بھائی کو ہوائی جہاز پر چڑھا کر اگلے دن ہم پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ مانک گنج ہی کا ایک تھانہ شوالایا تھا جسکے معائنہ کے لئے میرے شوہر نکلے تھے۔ تعجب کی بات دیکھئے کہ وہاں پہنچنے کے لئے ڈھاکہ اور منشی گنج سے دریا کے راستے گزر کر جانا پڑتا تھا۔

ضلع ڈھاکہ کی صدر کے علاوہ تین سب ڈویژنیں تھیں یعنی نرائن گنج، منشی گنج، اور مانک گنج۔ نرائن گنج تو جوٹ کی منڈی ہونے کے باعث بہت بڑا صنعتی علاقہ تھا۔ اگرچہ انتظامی سہولت کے لئے اسے سب ڈویژن بنا دیا گیا تھا۔ ورنہ مجموعی ترقی

میں یہ ڈھاکہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ نئی نئی تعمیر شدہ جدید وضع کی عمارات میں زندگی جدید سہولتوں اور روایات کے ساتھ رواں دواں تھی۔

منشی گنج گو فاصلے کے اعتبار سے مانک گنج سے دور تھا۔ گھر تک پہنچنے کا راستہ بھی زیادہ اچھا نہ تھا۔ مگر وہاں کا سفر نرائن گنج تک ریل میں اور اس کے بعد لانچ یا اسٹیمر کے ذریعے کیا جاتا ہے جو کہ ہر وقت دستیاب ہیں۔ اس لئے مجموعی طور پر دو تین گھنٹے میں یہ سفر طے ہو جاتا تھا۔ اس لئے منشی گنج کو مانک گنج سے بہتر اسٹیشن سمجھا سمجھا جاتا تھا۔ منشی گنج پہنچنے کے لئے ایک خاص حد تک بڑے دریا یعنی "ستیا لکھیا" میں لانچ کے ذریعہ جاتے۔ اس کے بعد ایک پتلی سی ندی میں تیرتی ہوئی چپوؤں کی کشتی دھیرے دھیرے منشی گنج لے جاتی۔ ندی کے دونوں طرف ہریاول، جمع شدہ پانی اور پٹ سن کے اونچے اونچے کھیتوں کے باعث مچھر اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ الامان والحفیظ۔ منزل پر پہنچتے پہنچتے انسان یہ بھول جاتا ہے کہ کرۂ ارض پر اس مخلوق کے بغیر بھی کوئی علاقہ ہو سکتا ہے۔

گو منشی گنج کے بھی بہت سے علاقے سطح سمندر سے نیچے ہیں جہاں سارا سال پانی رہتا ہے۔ مگر منشی گنج کی اپنی آبادی اونچائی پر واقع ہے۔ یہ وہی منشی گنج ہے۔ جہاں کے "امرتو شاگر" کیلے اپنی مٹھاس اور خوشبو میں پورے پاکستان میں اپنی مثال آپ تھے اس علاقہ کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ وابستہ ہے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جب شائستہ خاں کو دکن سے نکالا گیا تو وہ یہاں ہی آیا اور منشی گنج کے ایس، ڈی، او کا موجودہ مکان کچھ عرصہ کے لئے اس کا قلعہ تھا۔ ہم لوگ اسی تاریخی مکان میں ایک رات کے لئے ایس۔ ڈی۔ او منصور کاظم صاحب کے مہمان تھے۔ ان کی پُر تکلف مہمان نوازی کا لطف اٹھا کر دوسرے روز علی الصبح ہم پھر اپنی لانچ میں منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔

منشی گنج سے آگے گولنڈو کے مقام تک دریائے میگھنا اور پدما دونوں مل کر سمندر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بے حد بڑے دریا میں ہماری ننھی سی لانچ دھارے کی مخالف سمت میں آگے بڑھنے کے لئے تگ و دو کر رہی تھی۔ مون سون نے دریا کو اسقدر غضب ناک کر رکھا تھا کہ ہماری لانچ پوری جدوجہد سے ایک فرلانگ آگے جاتی، تو کوئی غضبناک لہر اسے اتنا ہی پیچھے دھکیل دیتی۔ صبح پانچ بجے سے اسٹیلا کا انجن چل رہا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب میں کیبن سے باہر نکلی تو میرا خیال تھا کہ منزل قریب ہی ہو گی۔ سارنگ سے پوچھا کہ کتنی دیر باقی ہے؟ تو اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "بیگم شاب وہ منشی گنج رہا۔" مڑ کر دیکھا تو منشی گنج کی عمارات صاف نظر آ رہی تھیں میں ہراساں ہو گئی۔ دریا میں کوئی اور بڑی لانچ یا کشتی نہ تھی۔ بس ہماری منّی سی اسٹیلا بپھرے ہوئے دریا کا مقابلہ کرنے کے لئے تن تنہا کمربستہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے سہمے ہوئے بچے کی طرح شوہر کو واپسی کا مشورہ دیا۔ مگر وہ آگے جانے پر بضد تھے۔ رات نو بجے تک ہم لوگ بمشکل چند میل آگے گئے ہوں گے کہ اسٹیلا کی ہمت جواب دیتی نظر آئی۔ اور سارنگ نے وہاں ہی لنگر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی ایک لنگر کو نیچے پانی میں اتارا ہی تھا کہ پھنکارتی ہوئی لہروں نے جیسے یک بیک حملہ کر دیا۔ سات آٹھ آدمیوں نے سارنگ کے ساتھ مل کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ لنگر اٹھا لیا۔ ورنہ قریب تھا کہ لانچ الٹ جاتی۔ تاریک رات، دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد۔ بس بپھری ہوئی غضب ناک لہریں ہر دم ہڑپ کرنے کو تیار تھیں۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران کتنی مرتبہ موت و حیات کو گلے ملتے دیکھا ہے۔ مگر انسان بھی خاصا سخت جان ہوتا ہے

ع بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگزرد

سارنگ کو، قریب ایک چھوٹی ندی یا یوں کہیے کہ خشکی کی طرف جاتے ہوئے ایک نالے کا احساس ہوا۔ لہٰذا وہ اسی کھال (چھوٹی ندی) کی جانب لانچ لے آیا۔ وہیں لانچ میں

ہمیں رات گزارنا تھی۔

لانچ کا انجن بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی روشنی اور پنکھا بھی ختم ہو گئے۔ گھُپ اندھیری رات۔ دریائی ڈاکوؤں کا خطرہ۔ شدید گرمی۔ پٹ سن کے جوٹ ماتھ۔ (پٹ سن پر اُڑنے والے کیڑے، وہ مچھروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں جہاں کاٹتے ہیں وہاں شدید جلن شروع ہو جاتی ہے) اور مچھروں کی یلغار۔ شب اس قدر طویل ہو گئی کہ صبح کرنا جوئے شیر کو لانا بن گیا۔ پوری رات، میں دونوں بچوں کے پاس بیٹھی ہوئی اخبار سے پنکھا کر کے مچھروں اور جوٹ ماتھ کو دور رکھنے کی سعی لاحاصل کے ساتھ مختلف قرآنی آیات اور استغفار کا ورد کرتی رہی۔ خدا خدا کر کے صبح صادق نمودار ہوئی سارنگ نے اذان دی ؏

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

کچھ زندگی کے آثار ہویدا ہوئے۔ لانچ کا عملہ باجماعت نماز پڑھنے کے لئے پچھلے ڈیک پر صف بستہ ہوا۔ اور میں بھی معبودِ حقیقی کے حضور سربسجود ہوئی کہ وہی خدائے برحق موت و زلیست پر قادر ہے۔ ایسے ہی مشکل لمحات انسان کو اپنے خالق کے پاس لے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لانچوں کے عملے کو عموماً میں نے بہت ہی مذہبی پایا اس کی غالباً وجہ یہی ہے کہ انہیں ہر وقت خطروں سے کھیلنا ہوتا ہے اور یہ خطرات ہی انہیں مذہب سے قریب کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

واپسی کا فیصلہ رات ہی کو کر چکے تھے۔ لہٰذا نماز سے فارغ ہو کر سارنگ نے انجن چلا دیا۔ قریب آدھے گھنٹے کے بعد روانہ ہونے کا سائرن بجایا اور ہم دریا کے دھارے کے ساتھ واپس ہونے لگے۔ شام کے چار بجے ہوں گے۔ جب ہم مانک گنج کے گھاٹ پر پہنچے۔ جس پگڈنڈی پر ہم پا پیادہ گھر تک جاتے تھے وہ پانی میں ڈوب

چکی تھی۔ حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ ہمیں لینے کے لئے دو بڑی کشتیاں آ چکی تھیں۔ ہم سب لانچ سے ان ہی میں اترے۔ راستہ میں ہر سمت پانی تھا۔ جب ہم گھر پہنچے تو برآمدہ سے پانی کوئی چھ انچ نیچے تھا۔ پتہ چلا کہ ایس ڈی او کا مکان علاقہ کی سب سے زیادہ اونچائی پر واقعہ عمارت ہے۔ باقی تمام شہر پانی میں گھرا ہوا تھا۔ تمام مکانات میں پانی بھر چکا تھا۔ مگر کسی کے چہرے پر فکر و تردّد کے آثار نہ تھے۔ کیوں کہ یہ سب تو نارمل تھا۔ جو ہر سال معمول کے مطابق ہوتا تھا۔ جس کے مقامی لوگ عادی تھے۔

جب کشتی ہمارے مکان کے احاطہ میں داخل ہوئی تو جھٹ پٹے کا وقت تھا ہمارے مکان کا باورچی خانہ مرکزی عمارت سے علیحدہ نسبتاً نشیب میں بنا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے باورچی خانہ ہی پڑتا تھا۔ میری نظر جو اُدھر گئی تو دیکھا کہ اس کے اندر پانی بھرا ہوا تھا۔ اور دروازہ پر ایک شخص کھڑا بلمے سے بالس کو بار بار باورچی خانے کے اندر پانی پر مار رہا تھا۔ جس سے چھپ چھپ کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے وہیں سے بلند آواز میں پوچھا۔ "کی کرچھو" (کیا کر رہے ہو)۔ اجنبی نے پہلے دانت نکالے اور پھر بے نیازی سے بولا۔ "بیگم شاب ماچھ دھورچھی" (بیگم صاحب میں مچھلی پکڑ رہا ہوں)۔ ایں! بھئی حد ہو گئی۔ ہمارے باورچی خانے سے اجنبی مچھلی پکڑ رہے ہیں اور وہ بھی بالس سے ؎

دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ہمارے ہمراہ جو مقامی افسر تھے انہوں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بتایا کہ پانی کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں آ جاتی ہیں اور کھلے پانیوں کی نسبت چھوٹے کمروں میں پکڑنا آسان ہوتا ہے۔ بالس کے سرے کو یہ لوگ اس طرح کچل دیتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی کھپچیاں سی سرے پر بن جاتی ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی مہارت ہوتی ہے کہ مچھلی کو دیکھتے ہی اس پر بالس کے اس سرے سے حملہ کر دیتے ہیں۔ اور مچھلی ان کھپچیوں میں پھنس

جاتی ہے۔

ہمارے گھر کے برآمدے سے کوئی چھ انچ نیچے پانی ہی پانی تھا چونکہ یہ بہتا دریا تو نہ تھا۔ لہٰذا علاقہ کی تمام غلاظت بھی ہمراہ تیر رہی تھی۔ ہمارے پانی کے ہینڈ پمپ کا اوپر کا سرا بھی پانی سے باہر تھا۔ باورچی خانہ کا سامان ہینڈ پمپ کے قریب ہی اونچے چبوترے پر رکھ دیا گیا تھا۔ مرچ مصالحے اور دیگر چھوٹی چھوٹی چیزیں پانی کی نذر ہو چکی تھیں۔ مگر لطف یہ کہ سوائے میرے اور کوئی ان حالات سے دہشت زدہ نہ تھا۔ میرے شوہر غالباً اپنی دحشت پر قابو پا چکے تھے۔ باقی تمام لوگ اسے سالانہ طبعی حالات کا ایک لازمی جزو سمجھ کر قبول کر چکے تھے اور بالکل نارمل تھے۔ رات کا کھانا کسی نہ کسی طرح پکا اور کھایا بھی۔ مگر میرے حواس کو ایک طرح کے بوجھ نے جامد کر رکھا تھا۔ ان غیر معمولی حالات کو میں مصیبت خیز آفت تو کہہ سکتی تھی۔ مگر ان میں ایک نارمل زندگی کی باقاعدگی کو ذہن قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ کسی طور رات کو اپنے جالی دار برآمدے میں سو گئے۔ تھکے ہوئے تھے لہٰذا جلد ہی نیند کی مہربان دیوی نے تفکرات اور حوادث سے نجات دلوادی۔

صبح کے اجالے میں بچی پر نظر گئی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سرخ چیونٹیوں سے بستر بھرا ہوا تھا اور معصوم ننھی سی بچی ان چیونٹیوں میں پڑی ہوئی محوِ خواب تھی۔ بچپن سے پڑھتے آئے ہیں کہ ننھی خیر النساء (جس کے مقدر میں بعد میں نورجہاں کے نام سے ملکۂ ہند بننا لکھا تھا) کی جنگل میں حفاظت ایک سانپ نے کی تھی۔ اس قصے کی ایک سچی تصویر میرے سامنے تھی۔ لال چیونٹیوں سے بھرے ہوئے بستر پر میری بچی بالکل محفوظ سو رہی تھی۔ بچی کو گود میں لیا تو باقی بستروں پر نظر پڑی تو سب پر وہی لال چیونٹیاں دھاوا بولے ہوئے تھیں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے ۔۔۔۔ میرے پروردگار ۔۔۔۔ !! مرنے کے بعد تو چیونٹیاں کھائیں گی ہی ، ہمیں تو زندگی میں ہی انہوں

نے گھیر لیا۔

برآمدے کے سامنے ایک کشتی کھڑی تھی۔ ملازم اسی پر سودا سلف لینے بازار جاتا تھا۔ گھر کے ایک کمرہ کو باورچی خانہ بنا لیا تھا۔ بظاہر گھرداری معمول پر آگئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میرے شوہر دفتر گئے۔ جو گھر کے ایک حصے میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ دفتر سے عدالتوں کی عمارت تک جو تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ اس پر بانسوں کا ایک پُل بنا دیا گیا تھا۔ یعنی چار پانچ بانس کی چوڑائی کو ساتھ ساتھ رسّوں سے باندھ کر دفتر اور عدالت کے درمیان ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔ یہ پل بادی النظر میں بالکل وہی چیز تھی جس پر سرکس میں ہاتھ میں چھتری لئے چلتے ہوئے اپنے کرتب دکھائے جاتے ہیں، اس پر چلیں گے کیسے؟ مگر میری حیرانی دوچند ہو گئی۔ جب میں نے چپڑاسیوں کو رسّہ پکڑ کر اِدھر اُدھر چلتے ہوئے دیکھا۔ انسان کے اندر بھی خدا تعالےٰ نے کیا کیا صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ وہی کام جو تماشوں میں کرتب کہلاتا ہے۔ بعض حالات میں معمول بن کر رہ جاتا ہے۔

میرے شوہر کو دفتر کے بعد عدالت جانا تھا۔ مجھے وحشت سے پسینہ آنے لگا کہ اس نٹوں والے بانس جیسے پل سے یہ کیسے گزریں گے اور پھر میں نے شوہر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بجائے اس پل کے کشتی سے عدالت جائیں گے۔

سب کام معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ دفتر ... عدالت ... گھر ... سب کچھ اسی طرح تھا جیسے یہ سب لوگ بے حد وحساب پانی کا مذاق اڑا رہے ہوں کوئی بھی تو ہراساں نہ تھا۔ بلکہ وہ سب خوش تھے۔ یوں جیسے انہیں اسی کا انتظار ہو، اور جس کا انتظار ہو وہ آجائے تو خوش ہونا قدرتی امر ہوا نا!۔

سہ پہر کو برآمدے میں کھڑی تھی کہ خوندکر رقیب الدین اپنی بیگم اور چار بچوں کو ایک پتلی سی کشتی میں بٹھائے خود ہی چپّو چلاتے ہوئے آگئے۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی

سے کھل اُٹھے اور بولے: "بیگم صاحب! میں نے موٹر خرید لی!" میں متعجب انہیں دیکھتی ہی رہی اور اتنی دیر میں ان کی بیگم اور بچّے خوش و خرّم کشتی سے اُتر کر برآمدے میں داخل ہو چکے تھے۔ رقیب الدین کشتی کو برآمدے کے ساتھ باندھ کر پھر گویا ہوئے "پورے تیس روپے میں یہ موٹر خریدی ہے"۔ اب میں سمجھی اور اس پتلی سی موٹر کو بہت دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ پانی کی برکات نے انہیں موٹر عطا کی۔ جس میں بیٹھ کر وہ سب ہوا خوری کے لئے نکلے تھے۔ رقیب الدین مقامی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خوف و ہراس جو میرے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور میرے چہرے بشرے سے صاف ہویدا تھا۔ ان کی یہ وضاحت اسے کم کرنے کی شفیق سی سعی تھی۔ "مانک گنج کا زیادہ تر علاقہ سطح سمندر سے نیچا ہے۔ اکثر علاقوں میں سال کے بیشتر حصّے میں پانی بھرا رہتا ہے۔ یہاں کے باسی پانی سے ہراساں نہیں ہوتے۔ بلکہ پانی سے انہیں محبّت ہے۔ پانی ہی انہیں خوراک مہیّا کرتا ہے اور قدرت نے پانی ہی کو ان کے لئے ذریعۂ آمد و رفت بنایا ہے۔ سال کے جس حصہ میں پانی خشک ہوتا یعنی اتنا نہیں ہوتا کہ ہر جگہ کشتی سے جایا جا سکے۔ یہ وقت مقامی لوگوں کے لئے خاصا پریشان کن ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کیچڑ اور دلدل کے باعث پیدل فاصلے طے کرنا بہت ہی دقّت طلب مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے کئی ذیلی علاقے بالکل کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ خوشیاں تو اس علاقے میں برسات کے موسم میں ہی منائی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ جب ہی ہوتا ہے جب پانی چاروں طرف بھر جاتا ہے۔ لہٰذا بیگم صاحب آپ بالکل خوف زدہ نہ ہوں۔ یہ حالات بالکل طبعی اور نارمل ہیں..."

میں لاجواب سی ان سب کو حسرت زدہ نظروں سے دیکھتی رہی کہ وہ سب خوش تھے۔ حالانکہ ان کے مکانات کے اندر پانی بھرا ہوا تھا۔ اور گھر کی ہر چیز چھت کے ساتھ مچان بنا کر رکھ دی گئی تھی۔ یعنی مجموعی طور پر میرے حالات ان کے مقابلے میں سو

فیصد بہتر تھے۔ میں نے نفسیاتی طور پر قوتِ استدلال سے اپنے ذہن کو خوف کے چُنگل سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ "جب باقی سب میری طرح کے انسان اُن بدتر حالات میں خوش رہ سکتے ہیں تو میں ہراساں ہونے میں قطعی حق بجانب نہیں ہوں۔" اتنی کوشش کے باوجود یاسیت مجھ پر مسلط رہتی اس لئے کہ میں نے معزبی پاکستان کی ایک خشک اور پتھریلی وادی میں جنم لیا تھا۔ جہاں ادھر بارش ہوئی اور اُدھر مطلع صاف اور ساتھ ہی سڑکیں بھی صاف شفاف، نہائی، دھوئی، مسکراتی ملتی ہیں جہاں پانی کے سمندر میں نارمل زندگی گزارنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۷۱ء سے قبل معزبی پاکستان میں برسات کے موسم میں اخبارات میں طغیانیوں اور طوفانوں کی خبریں چھپتی تھیں۔ اسے آفت زدہ علاقہ قرار دے کر لوگوں سے مدد کی اپیلیں شائع ہوتی تھیں تو میں حیران ہوتی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان جسے میں جانتی ہوں اس میں برسات آفت نہیں ہوتی بلکہ خوشیاں لاتی ہے۔ پردیس میں بیاہی ہوئی لڑکیاں اس موسم کا سارا سال انتظار کرتی ہیں۔ جب پانی ہر جگہ کے لئے ذریعہ آمد و رفت بن جاتا ہے اور ان کا بیرن یا بابل کشتی لے کر انہیں لینے آتا ہے۔ یہی موسم جسے ہم مصیبت خیز طوفانوں سے منسوب کرتے ہیں وہاں کی دلہنوں کو میکے کی سہانی یادیں تازہ کرواتا ہے۔ کیوں کہ دیہاتوں میں اور کوئی تو ذریعہ آمد و رفت نہیں کہ لوگ جب چاہیں رشتہ داروں کو ملنے دور دیس چلے جائیں۔ گھوڑا، خچر، اونٹ، رکشا تانگہ، موٹر یا جیپ کچھ تو ملنا ممکن نہیں۔ جب پانی ذرا کم ہو جاتا ہے تو جگہ جگہ دلدل والی زمین کی وجہ سے پیدل جانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں پانی کا ہر طرف پھیلنا تشویشناک المیہ نہیں۔ بلکہ پیغامِ مسرّت ہوتا ہے۔ اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی کبھی یہ حد سے بڑھ جاتا ہے اور امداد طلبی کی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن اس قدر نہیں جس قدر کہ ہر روز سیاسی سطح پر اپیلیں کی جاتی رہی ہیں۔

یہی برسات کا موسم وہاں کے غریب مانجھیوں کو روزی کا مژدہ سناتا ہے، اس موسم میں کشتیاں ٹیکسیوں کی طرح گھومتی ہیں، جس طرح یہاں ٹیکسی کے مالکان کے پاس کئی کئی موٹریں ہوتی ہیں جو کرایہ پر چلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی سرمایہ داروں کے پاس کئی کئی کشتیاں ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض تو بہت بڑی ہوتی ہیں جن کے اوپر چھت پڑی ہوتی ہے اور ان میں کئی خاندان رہ سکتے ہیں یا پورا مال کا گودام ہوتا ہے۔ یہ کرائے پر مانجھیوں کو چلانے کے لئے دی جاتی ہیں۔ بعض مانجھی اپنی کشتیوں کو خود بھی چلاتے ہیں جیسے یہاں اکثر ٹیکسی والے موٹر کے خود ہی مالک ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ٹیکسیاں بارہ مہینے چلتی ہیں اور وہاں کشتیاں اُسی موسم میں زیادہ روزی پیدا کرتی ہیں۔ جب پانی چاروں طرف بھر جائے۔ اسی لئے غریب مانجھی اس موسم کو جسے ہم طوفان و آفت سے موسوم کرتے ہیں "رزق و روزی کا موسم" کہتے ہیں کیوں کہ ان ہی دنوں میں وہ سال کی بیشتر کمائی کرتے ہیں۔

جب پانی ہر طرف پھیل جاتا ہے تو قدرت ہر فرد کو خوراک اس کے گھر بھیج دیتی ہے۔ گھر کے سامنے پانی کے ساتھ مچھلی بھی آجاتی ہے۔ چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کا تو دن بھر شغل ہی مچھلی پکڑنا ہوتا ہے۔ یہ مچھلی وہ کسی طرح سکھا کر نسبتاً خشک موسم کے لئے بھی محفوظ کر لیتے ہیں۔ جہاں زمین ذرا اونچی ہوتی ہے وہیں چند گھر بانس کی چٹائیوں سے بنا لئے جاتے ہیں اس کو گاؤں کا نام دے لیجئے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لڑکیاں گھر کے باہر بانس سے ملائے ہوئے ٹوکری نما جال کو ایک خاص طریقے سے پانی میں لگا کر اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھاگ کر جال کو دیکھ لیتی ہیں۔ جو مچھلیاں اس میں آگئی ہوں انہیں رکھ کر جال پھر اسی طرح لگا کر گھر کے اندر چلی جاتی ہیں۔ بچوں کا بھی مچھلی پکڑنے کا تقریباً یہی طریقہ ہے۔ دور سے رنگ برنگی دھوتیوں میں ملبوس مچھلی پکڑنے کے

لئے بھاگتی ہوئی یہ لڑکیاں بے حد آرٹسٹک اور رومانی لگتی ہیں۔

اس کے علاوہ بھی پانی کا چاروں طرف بھرنا قدرت نے خالی از مصلحت تو نہیں رکھا۔ وہ پٹ سن جس کے لئے یہ علاقہ مشہور ہے ان پانیوں میں ہی پروان چڑھتی ہے اگر یہ پانی ہر طرف نہ پھیلے تو چاروں طرف کئی کئی گز اونچے پٹ سن کے کھیت کہاں جائیں؟ اور یہ علاقہ اپنی اس سنہری دولت کو کہاں سے پائے۔ اس پانی کو کسی شہری کی سیاسی نظر سے نہ دیکھئے۔ اس کی اہمیت ایک عام غریب دیہاتی سے دریافت کیجئے کہ یہ پانی ہی تو اس کی زندگی ہے۔

اس علاقہ کے لوگ برسات میں دریا کے محتاج نہیں رہتے۔ بلکہ ہر طرف کشتیاں چلتی ہیں۔ پٹ سن کے اونچے اونچے کھیتوں کے اوپر کشتیاں یوں تیرتی نکل جاتی ہیں جیسے ان کو پر لگ گئے ہوں۔ اپنے شوہر کے ساتھ دورے پر جاتے ہوئے جب پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ سامنے کے اونچے پٹ سن کے پودوں کے اوپر سے ہماری کشتی گزرے گی تو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا۔ ہم نے تو اپنی عمر میں کشتی کو دریا میں ہی چلتے دیکھا تھا۔ درخت جتنے اونچے پودوں کے اوپر سے اس کا تیرتے ہوئے گزرنا تو کبھی تصوّر میں بھی نہ آیا تھا۔ مگر وہ مانجھی اپنے کام میں اتنے مشّاق ہیں اور اس مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ کھیتوں پر سے کشتی گزارتے ہیں کہ سوائے کشتی کی لکڑی اور پودوں کی رگڑ سے "روں روں" کی آواز پیدا ہونے کے اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

یوں تو جہاں اونچی اور خشک زمین کا ٹکڑا ہو وہاں ہی عموماً بستی بھی ہوتی ہے مگر کہیں کہیں تو پانی میں کوئی تنہا جھونپڑی بھی بنی ہوئی نظر آجاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان جھونپڑیوں کے مکیں اس موسم میں کہیں اور چلے جاتے ہوں گے مگر جب ایک جھونپڑی کے قریب سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو خدائے برحق کی رزاقی کا

معجزہ نظر آیا۔ واقعی وہ بے نیاز پتھر کے اندر کیڑے کو بھی رزق پہنچا دیتا ہے۔ چھوٹی سی بغیر دروازے کی تنہا جھونپڑی میں دو بانس کی چٹائیوں کی بنی ہوئی دیواروں کے درمیان چند بانسوں کو مچان کی شکل میں باندھ لیا گیا تھا اور اس پر ایک آدمی آرام سے سو رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر پانی... باہر پانی... چاروں طرف پانی ہی پانی.... آبادی کا خاصی دور تک نشان نہیں.... یا اللہ!!... اگر یہ آدمی مچھلی پکڑ بھی لے تو کہاں پکا کر کھاتا ہوگا؟ ضروری حوائج کے لئے کیا کرتا ہوگا بس خدا کے بھید خدا ہی جانے...

میں بھی کہاں بھٹک گئی۔ بعض اوقات طائرِ خیال کی پروازیوں بے قابو ہو کر کہیں سے کہیں لے جاتی ہے کہ میں خود بے بس ہو جاتی ہوں تو میں یہ عرض کر رہی تھی کہ میں خشکیوں پر رہنے والے ان پانیوں میں کوشش کے باوجود نارمل زندگی نہ گزار سکی۔

دریں اثناء مسٹر نیوگی کی گرفتاری اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ وہ خود تو بہت اونچی ضمانت پر رہا ہونے کے بعد بھارت فرار ہو چکا تھا۔ مگر صوبائی حکومت کا عتاب میرے شوہر پر نازل ہونے کے لئے تیار تھا۔

ان ہی دنوں کیپٹن حلیم چودھری آگئے۔ یہ مسلح فوج میں میرے شوہر کے ساتھی رہ چکے تھے۔ مانک گنج کے ایک چھوٹے سے دیہات کے رہنے والے پاکستانی فوج کے یہ کپتان اپنی بیگم اور چھ سات بچوں کی پلٹن کے ہمراہ کئی مرتبہ پہلے بھی ملنے آ چکے تھے مگر اس دفعہ ان کے خلوص میں کچھ اور ہی جوش تھا۔ مسٹر نیوگی کے قصے نے انکے پاکستانی جذبات کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ خوشی کے مارے دُبلے پتلے کیپٹن حلیم کا گورا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ (ان کا گورا رنگ اپنے ماحول میں منفرد نظر آتا تھا) وہ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑ کر بار بار دہرا رہے تھے "یار کمال کر دیا تم نے"۔ میرے شوہر کے یہ کہنے پر

کہ نہ جانے حکومت کا ردِّ عمل کیا ہو گا۔ وہ اچھل پڑے ۔" بھیّا! خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ ضرور تمہاری بہتری کرے گا۔" دراصل علاقے کے گنتی کے چند پڑھے لکھے مسلمان ہندو گردی اور ہندو نوازی سے تنگ تھے۔ مگر مسلمانوں کی اس اکثریت کی جہالت، مفلسی اور عسرت انہیں منہ کھولنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ یہ لوگ ہندوؤں کی امتیازی حیثیت کو اس طرح قبول کر چکے تھے کہ ان کی جھاڑو کو بھی مقدس مقام دینے کو تیار تھے۔

پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

یہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پہلے ہفتے کا کوئی دن تھا۔ جب اچانک ڈھاکہ سے بذریعہ تار میرے شوہر کے تبادلے کے احکامات آئے۔ گو یہ احکامات زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کے پسِ پردہ نیوگی کی گرفتاری کارفرما تھی۔ مگر میں نے پروردگار کا شکر ادا کیا کہ اس سمندر سے نجات ملے گی۔ میری ٹانگیں تو چلنا ہی بھول چکی تھیں۔ تین کمروں اور برآمدے کی چند گز زمین کے علاوہ خشکی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ چنانچہ خوشی خوشی سامان باندھا اور رانگامٹی کو خیرباد کہہ کر ڈھاکہ روانہ ہوئے۔

ڈھاکہ کے سرکٹ ہاؤس میں اوپر کی منزل کے بائیں بازو پر ہمیں ایک کشادہ کمرہ اور ملحقہ غسلخانہ مل گیا۔ اس کمرہ کی وسعت نے ہماری تمام ضروریات کو اپنے

اندر سمو لیا۔ یہی ہمارے سونے ، کھانے اور دوستوں سے ملنے کا کمرہ تھا۔ لطف یہ کہ مغربی پاکستان سے چند ساتھی جو ڈھاکہ آئے تو ہم نے دس بارہ آدمیوں کی دعوت کا ہنگامہ بھی اسی کمرے میں کر ڈالا۔ تو میں اس صاف ستھرے اور پیارے سے کمرے کی وسیع القلبی کی قائل ہو گئی۔ ہمیں ابھی مکان گورنمنٹ کی طرف سے الاٹ نہیں ہوا تھا۔ اور مکان کی دستیابی تک ہمیں سرکٹ ہاؤس کی (ہماری مالی حیثیت سے بہت زیادہ اخراجات کی حامل) مہمان نوازی کا قہر درویش بر جان درویش، لطف اٹھانا ہی تھا۔

میں ڈھاکہ کی سہولتوں اور سڑکوں کو بالکل ایک نادان دیہاتی کی طرح دیکھ رہی تھی پیدل چلنے کی بھی ایک جسمانی پیاس ہوتی ہے جسے کم ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اکتوبر یوں بھی بنگال کا خوش گوار ترین موسم ہوتا ہے۔ صبح اور شام کی لمبی لمبی سیریں ایسی فرحت بخش تھیں کہ ہلکی پھلکی فضا میں مانک گنج کی گھٹن کی یاد بہت دور کی شے لگنے لگی۔ اور یوں محسوس ہونا جیسے ایک طویل تڑپا دینے والی پیاس کے بعد ٹھنڈا اور میٹھا آبِ حیات مل گیا ہو۔

ابھی ملازمت پر نیوگی کا سیاہ سایہ کسی حد تک موجود تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آیا مانک گنج سے تبادلہ ہی کافی سمجھا جائے گا۔ یا ہندو وزراء اس سے بھی آگے کچھ چاہیں گے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے ... صبح سویرے میرے شوہر تیار ہو کر دفتر کے لئے باہر نکل رہے تھے۔ میں کمرے کے دروازے کے ساتھ پتلی سی گیلری میں بیٹھی دھوبی کو کپڑے دے رہی تھی۔ جب دروازے کے نیچے سے اخبار والے نے اخبار اندر سرکایا۔ زمین پر پڑی ہوئی اخبار پر جوں ہی میری نظر پڑی میرے ہاتھ سے کاپی اور پنسل چھوٹ گئی اور دہن سے میں نے اپنے شوہر کو بلانے کے لئے ایک ہانک لگائی

لگائی جو راہداری کے موڑ پر پہنچ چکے تھے . . . . ملک میں فوجی انقلاب آچکا تھا۔ یہ ہماری زندگی میں ایک نئی اور انوکھی سی خبر تھی۔ چند لمحوں کے لئے خون کی گردش سرسراہٹ بن کر جسم میں دوڑ گئی۔ ردِ عمل کیا تھا۔ اس کی وضاحت میں نہیں کر سکتی۔ مگر تجسّس سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہم لوگ اخبار کو جلدی جلدی پڑھ رہے تھے۔

ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ملک کا نظم و نسق مکمل طور پر فوج کے ہاتھ میں تھا۔ حالانکہ میں اس علاقہ سے تعلق رکھتی تھی جو اپنی عسکری خصوصیات کے لئے پورے برصغیر میں صدیوں سے مشہور چلا آتا ہے۔ سچ پوچھئے تو میرے خاندان میں سوائے میرے شوہر کے سبھی مرد فوج میں کوئی نہ کوئی عہدہ لئے ہوئے تھے۔ فوجی میرے لئے کوئی نئے نہ تھے۔ مگر نہ جانے کیوں یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے . . . جیسے بالکل جنوں اور پریوں کی کہانیوں کی طرح یک دم کوئی انوکھی بات ہو جائے گی۔

ہندو وزراء اور دیگر امراء تو فوری طور پر یوں غائب ہو گئے کہ ان کا اتہ پتہ بھی نہ ملا جو پاکستان میں رہے وہ روپوش ہو گئے اور ان کی سماجی اور سیاسی سرگرمیاں مکمل طور پر زیر زمین چلی گئیں۔

ان ہی دنوں کیپٹن حلیم چودھری آئے۔ ان کا تبادلہ بھی ڈھاکہ ہو چکا تھا۔ وہ مارشل لاء سے اس قدر خوش تھے کہ ان کے ہر موئے بدن سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ کہنے لگے "یہ سب تو بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا۔ مجھے صرف یہ شکوہ ہے کہ مارشل لاء دیر میں لگا۔ اب اس ہندو نوازی کا قلع قمع ہو جائے گا۔" وہ بنیادی طور پر بے حد جذباتی انسان تھے۔ مانک گنج کے دیہی علاقے سے تعلق کے باعث ہندوؤں کی بالادستی سے سخت عاجز تھے۔ اور ان کے نزدیک مارشل لاء کا صرف ایک فائدہ تھا۔ وہ تھا ہندوؤں کی بالادستی کا خاتمہ۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ اس کی

ضرورت سمجھتے تھے۔ خوشی کے مارے وہ ہمارے لئے نہایت ہی لذیذ "چم چم" کا ایک دو نا لے آتے تھے۔

حالات کا تموج پرسکون ہو گیا۔ لوگ نئے حالات کے عادی ہوتے گئے۔ میرے شوہر وزارتِ صنعت میں انڈر سیکرٹری متعین ہو گئے۔ گھر ملنا باقی تھا وہ مسئلہ کفیل الدین محمود نے حل کر دیا۔ ان کی ضلع کشتیا والی شفقت یہاں بھی آڑے آئی۔ انھیں ایک بڑا گھر مل گیا اور ان کا عظیم پورہ والا فلیٹ ہمیں مل گیا۔

ڈھاکہ میں عظیم پورہ میں نو تعمیر شدہ فلیٹوں کی ایک بستی تھی جو اس وقت گورنمنٹ ملازمین کی سب سے بڑی پناہ گاہ سمجھی جاتی تھی۔ بے شمار تین منزلہ عمارتیں، ہر عمارت میں چھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بنے ہوئے فلیٹ .... یہ بستی قبرستان کی زمین پر بنی ہوئی تھی۔ ابھی تک قبرستان کا کچھ حصّہ بعینہٖ فلیٹوں کے سامنے موجود تھا۔ اس لئے اکثر لوگ وہم کے مارے ان مکانوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر مجھے ہاتھ سے ہاتھ ملائے، دوستی اور اخوّت کا درس دیتے ہوئے یہ فلیٹ بہت اچھے لگے۔ خصوصاً جو آڈانگہ اور مانک گنج کے بعد یہ ننھا منا فلیٹ میرے لئے ایک چھوٹی سی جنت تھی... جہاں نہ سانپ تھے اور نہ شیر۔ اور نہ ہی ہر طرف پھیلے ہوئے پانی کی آفتِ آسمانی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکان میں بجلی بھی تھی اور جدید طرز کے ملحقہ غسلخانے کی آسائش بھی۔ میں اٹھارھویں صدی کی زندگی گزارتے گزارتے تھک گئی تھی۔ لہٰذا بیسویں صدی کی سہولتوں سے مزیّن یہ فلیٹ پا کر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔

گھر مل گیا تو امورِ خانہ داری کی طرف توجہ ہو گئی۔ مسز جلال نے اپنی ملازمہ "موتیر ماں" جو ان کے پاس چاٹگانگ میں ہوا کرتی تھی اور مجھے بہت پسند تھی مجھے دیدی۔ بچّی کے لئے ایک عیسائی آیا کا بندوبست ہو گیا۔ "موتیر ماں" نے میرے ساتھ مل کر گھر کو ترتیب دیا۔ ڈرائینگ روم اور کھانے کا ایک مشترکہ کمرہ تھا۔ اور دو چھوٹے چھوٹے

سونے کے کمروں کے سامنے ننھا سا تنگ برآمدہ۔ برآمدے کے کنارے پر باورچی خانہ اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ جو میری دونوں ملازم عورتوں کے تصرف میں آگیا۔

عظیم پورہ کے ساتھ بہت سہانی یادیں وابستہ ہیں۔ سب ساتھی دوست پاس پاس کے گھروں میں رہتے تھے۔ دن میں ہم خواتین اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتیں مگر شام کو عموماً سب ایک جگہ جمع ہوجاتے۔ اکثر سب کے گھروں سے کھانا بھی ایک ہی جگہ آجاتا۔ سادہ سا کھانا . . . مگر کئی گھروں کا کھانا مل کر باقاعدہ دعوت کا سامان پیدا کر دیتا۔

ہم سب کے شوہر حکومت مشرقی پاکستان کے ذمہ دار افسر تھے۔ اکثر ایک آدھ ضلع کے ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ مگر ہم میں سے کسی کے پاس موٹر نہ تھی اور نہ ہی موٹر کے بغیر زندگی ادھوری لگی۔ روزانہ کا سودا سلف قریب کی مارکیٹ سے آجاتا۔ دفتر جانے کے لئے یہ افسران دو دو مل کر ایک رکشا کر لیتے تاکہ کرایہ کا بوجھ بٹ جائے زندگی کے تقاضے اُلجھے ہوئے نہ تھے۔ بلکہ زندگی ایک سیدھی اور صاف ڈور تھی۔ جس میں کوئی گرہ نہ ہو۔ سادہ زندگی بھی ایک نعمت ہے۔ جس کا مزہ ہم نے مشرقی پاکستان میں ہی چکھا۔

عید یا شب برات یا کسی اور قومی تہوار پر ہم سب مل کر ملازمت کے سینیئر افراد اور حکومت کے اعلیٰ افسران کے یہاں بالکل اسی طرح جاتے جس طرح بزرگ رشتہ داروں کو ایسے موقعوں پر سلام کرنے جاتے ہیں۔ رکشاؤں پر ہی چرخ چوں کرتے ہوئے۔ بغیر کسی دماغی الجھاؤ یا جھجک کے۔ گورنر کے پرنسپل سیکرٹری نے دو مرتبہ ہمیں گورنر ہاؤس میں رات کے کھانے پر مدعو کیا اور ہم بڑی شان سے رکشا پر ہی گئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ موٹر اور دیگر ایسے تکلفات وہاں افسروں کی زندگی کا لازمی جزو ابھی تک نہ بنے تھے۔ جدید تصنع کے بغیر زندگی کتنی آسان تھی۔

مارشل لاء کے بعد مشرقی پاکستان میں سلطان الدین صاحب پہلے گورنر مقرر ہوتے چونکہ یہ مسز کفیل الدین کے والد تھے لہٰذا بیٹی اور داماد کی دوستی کے ناطے ہم پر بھی مہربان تھے۔ ہمیں جب انہوں نے شام کی چائے پر مدعو کیا تو اپنی موٹر بھی ہمارے لئے بکمالِ لطف وکرم اس لئے بھیجی کہ ان کے داماد کے پاس بھی موٹر نہ تھی اور وہ پہلی اور آخری مرتبہ تھی۔ جب ہم موٹر پر گورنر ہاؤس گئے۔ مگر بغیر کسی احساسِ تفاخر کے بمسز سلطان الدین میں تکبّر و نخوت کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ ایک اچھی خاتونِ خانہ اور شفیق ماں تھیں۔ انہیں شکوہ یہ تھا کہ گورنر ہاؤس کے خانسامے، بیرے اور بٹلر کے چکر میں انہیں امورِ خانہ داری کے جوہر دکھلانے کا موقعہ نہیں ملتا۔ پھر بھی وہ کھانے کی تھوڑی بہت نگرانی کر ہی لیتیں۔ سلطان الدین صاحب نے اپنے سرسبز و شاندار باغ میں رنگ برنگی پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ہماری بہت سی متحرک تصاویر لیں جو ہم کبھی نہ دیکھ سکے۔ چونکہ چند ماہ کے بعد ہی انہیں گورنر کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا اور ذاکر حسین صاحب ان کی جگہ اس عہدے پر فائز ہوئے۔

زندگی میں پہلی دفعہ اتنا عبرتناک واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سلطان صاحب سفیر بھی رہ چکے تھے اور اب گورنری سے سبکدوش ہوئے تھے۔ مگر ان کا کوئی ایسا مکان نہ تھا جو اس آڑے وقت میں پناہ گاہ بنتا۔ آخر کفیل الدین صاحب نے اپنے گھر میں انہیں پناہ دی۔ میں نے انہیں گورنری کی خیرہ کن چمک دمک کے پس منظر میں دیکھا تھا۔ جب سنا کہ وہ ٹوکری لے کر سودا سلف لا رہے تھے تو میں کانپ گئی ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ ! دوام صرف اسی ذات پاک کو ہے۔ باقی ہر شے فانی ہے۔ ہر قوت اور ہر شان کو فنا ہے ۔ ۔ ۔

عظیم پورہ میں ہمارے سامنے والے فلیٹ میں محبوب الزمان رہ رہے تھے۔ یہ میرے شوہر کے بیچ کے افسر تھے۔ ہم لوگ ولایت میں اکٹھے رہ چکے تھے۔ سانولا رنگ، دراز

قد، نہایت متناسب اور صحت مند جسم، مگر بے داغ کردار کے مالک زمان، مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ولایت کے قیام کے دوران میرے شوہر کے بلیشتر ساتھی افسران کردار کی لغزش کو مہذب اور نئی روشنی کی پرکشش شخصیت ہونے کی امتیازی علامت گردانتے تھے۔ یہ شخص اپنے حال میں مست، مغرب کی مقناطیسی حسن کی حامل ان تمام عفریتی آلائشوں سے دور رہا۔ حالانکہ اپنی مشرقی مردانہ وجاہت کے ساتھ اچھا خاصا ہیرو قسم کا کردار بن سکتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں نے مشرقی پاکستان کے افسران مجموعی طور پر زیادہ مستحکم کردار کے مالک پائے۔ ممکن ہے یہ بات سو فیصد صحیح نہ ہو۔ مگر یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور اپنی رائے ہے۔

زمان کی بیگم اپنے دو کمسن بیٹوں اور گھر کے کاموں میں دن بھر مصروف رہتیں۔ شام کو چائے کے ساتھ عموماً قیمہ بھرے سموسے جنہیں وہ "سنگھاڑے کہتی تھیں بناتیں۔ ہم لوگ جب بھی موقع ملتا مسز زمان کے بنائے ہوئے لذیذ سموسے اور پوریاں کھاتے۔ ان کے کان میں مستقل تکلیف رہتی تھی اور اسی لئے زمان کوشاں تھا کہ کسی کورس میں امریکہ جا کر بیوی کا علاج کروائے۔ یہی وجہ تھی کہ زمان کا پڑوس زیادہ دن تک نہ ملا، اور وہ جلد ہی چلا گیا۔

چند روز فلیٹ خالی رہا اور پھر حبیب الرحمٰن وہاں آگئے۔ حبیب ہمارے ساتھ چٹاگانگ میں رہ چکے تھے۔ ہماری اچھی دوستی تھی۔ یہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سی ایس پی افسر شادی کے معاملے میں بہت اونچے جا رہے تھے۔ بنگال میں تو اکثر وزرا یا صنعت کار جن کے پاس نئی نئی دولت آئی تھی، باقاعدہ اپنی صاحبزادی اور اس کے ساتھ دیئے جانے والے جہیز کی اشیاء اور نقد رقم کی فہرست بنا کر ایسے افسروں کے پاس بھجواتے تھے۔ چٹاگانگ میں سرکٹ ہاؤس کا بٹلر اکثر ایسے رشتے حبیب کے پاس لے کر آتا تھا۔ ایک مرتبہ بٹلر نے کہا کہ لڑکی کے جہیز میں پچاس ہزار روپے کی تو

صرف کٹکری ہوگی۔ تو جیب ہمارے پاس بیٹھ کر خوب ہنسا کہ "بھئی بٹلر مجھے کٹکری کی دکان پر بٹھوانا چاہتا ہے۔"

خلیب کو ابھی تک کوئی لڑکی پسند ہی نہ آرہی تھی۔ ایک روز جیب نہایت جذباتی انداز میں ہمارے یہاں آئے۔ جذبات کی شدت انہیں جلدی بولنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بولے "بھابھی! ایک لڑکی مجھے بہت پسند آئی ہے اور اب آپ ہی اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہیں۔" بھلا مجھے ان کی مدد کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ عقدہ یہ کھلا کہ ان کے فلیٹ کے پچھواڑے والے فلیٹ میں ایک لڑکی تھی جو انہیں بے حد پسند آئی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ کی اس سے بات چیت ہوئی ہے"۔ بولے "ارے نہیں، بس دیکھتا ہی ہوں، بے حد متناسب جسم کی بے حد پر وقار لڑکی ہے۔ لمبے لمبے بال کھولے اپنے صحن میں کام کی غرض سے اکثر آتی رہتی ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں"۔ "مگر جیب بھائی! میں کیسے پہچان پاؤں گی۔ اگر گھر میں کوئی اور لڑکی بھی ہوئی تو!" میں نے زچ ہو کر کہا تو وہ بہت اعتماد سے کہنے لگے۔ "نہیں گھر میں کوئی اور لڑکی نہیں اس میں ایسی انوکھی تمکنت ہے کہ آپ دیکھتے ہی پہچان جائیں گی۔" طے یہ پایا کہ شام کو میں ان کے گھر جاؤں گی اور مناسب موقع پر لڑکی کے لئے بات کروں گی۔"

شام کو جب میں جانے کے لئے نکلی تو جیب بھائی آئے اور کہنے لگے۔ "بس ابھی ابھی وہ صحن سے کمرے میں گئی ہے۔ آپ میری پسند کی ضرور داد دیں گی۔" جیب بھائی میرے ساتھ اس فلیٹ تک گئے اور آخری مرتبہ مجھے تاکید کر کے واپس چلے گئے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک لحیم شحیم مرد نے دروازہ کھولا۔ میں اندر گئی تو ایک معمر خاتون نے مجھے بٹھایا۔ اور جونہی بڑا سا جوڑا بنائے ہوئے ٹہنی کا سا لچکدار جسم لئے وہ لڑکی ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی تو اس تراشے ہوئے حسین مجسمے کو میں پرستائش نظروں سے چند لمحوں تک دیکھتی رہی۔ ننھا بیٹا بھی آکر ماں کی گود میں بیٹھ گیا اور وہ

پُروقار خاموشی سے بیٹھی رہی اور میں اس کی ساس سے چند پُر تکلف باتیں کر کے پندرہ منٹ میں واپس لوٹ آئی۔ اس کے بعد کافی دن تک حبیب بھائی کو اس لڑکی کے لمبے چوڑے خاوند کا ذکر کر کے میں نے تنگ کیا۔ مگر وہ کچھ خاموش سے ہو گئے۔

ڈھاکہ میں جتنے مغربی پاکستان کے افسر تھے۔ آپس میں بہت محبت سے رہتے تھے۔ اصولاً اقلیت میں خود بخود اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ شاید اتحاد ہی ان کی بقا ر کا ضامن تھا۔

اب تک تو مرکزی ملازمتوں کی بنیادی شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ بھی کہ ہر افسر کو مشرقی پاکستان میں پانچ سال ملازمت کرنی ضروری بھی۔ عموماً شروع میں ہر بیج کے اچھے افسران کو ملک کے دوسرے بازو میں بھیجا جاتا تھا اور اس طرح دوسرے بازو کا تبادلہ ذاتی طور پر تکلیف دہ ہونے کے باوجود قابلیت اور صلاحیت کی علامت بن گیا تھا۔ لہٰذا افسران خوشی خوشی رختِ سفر باندھا کرتے تھے۔ مگر ۱۹۵۸ء کے بعد اس اصول کے نفاذ کو عملی طور پر روک دیا گیا۔ اور اس طرح مرکزی ملازمتوں کے لئے دونوں بازوؤں کے مابین لازمی مدتِ ملازمت کے اصول کے نفاذ کے خاتمہ کے بعد دوسرے بازو کا تبادلہ سزا کے طور پر کیا جاتا اور یہ حکومت کی ناراضگی کی علامت بن گیا۔ چنانچہ مشرقی پاکستانی افسران جو مغربی پاکستان میں تھے واپس بھیج دیئے گئے، اور مغربی پاکستان کے افسران جو مشرقی پاکستان میں متعین تھے اپنی قسمت کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ یہ کربناک انتظار طول کھینچتا جا رہا تھا۔ حالات کی اس بے یقینی نے ان افسران میں اخوت اور محبت کی لہر دوڑا دی۔ ان کی فارغ اوقات کی تفریح یہی بھی کہ مل کر بیٹھیں اور اپنے غیر یقینی حالات پر تبادلہ خیالات کریں۔

سرکاری سطح پر بھی ایک طرح کی تبدیلی محسوس کی جا رہی بھی۔ ملازمتوں میں مشرقی پاکستانیوں کو واضح طور پر سبقت ملنے لگی بھی۔ رفتہ رفتہ مشرقی پاکستانی دوستوں کے

رویّہ میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ اس سے قبل سب ایک ہی ملازمت کے رکن تھے۔ ملازمت میں شرکت کے بعد پاکستان میں کسی ایک خطے کے فرد کو دوسرے خطّے کے فرد پر سوائے استعداد اور صلاحیّت کے برتری حاصل نہ تھی۔ حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ مشرقی پاکستانی دوستوں کی باتوں میں احساس برتری جھلکنے لگا۔ نہ کہنے کے باوجود یوں لگتا جیسے زبانِ حال سے گویا ہوں: "یہ خطّہ ہمارا ہے تم کیوں ہمارا حق غصب کرنے یہاں بیٹھے ہوئے ہو" اور یہ مغربی پاکستانی افسران جو خوشی سے وہاں نہیں گئے تھے۔ بلکہ ملازمت کے ہاتھوں یوں مجبور ہو چکے تھے کہ نہ مرکز میں کوئی پرسانِ حال تھا اور نہ جائے ملازمت پر حق باقی نظر آ رہا تھا۔ یوں محسوس کرتے جیسے سب کے سب بیچ منجدھار میں کسی ڈگمگاتی کشتی پر سوار ہوں کہ نہ آگے جا سکیں اور نہ پیچھے ہی آ سکیں۔ صورتحال ان لوگوں میں احساسِ محرومی و شکست پیدا کرتی جا رہی تھی۔ ہمارے ایک دوست اکثر کہتے تھے: "حالات کے تلوّن نے میری زندگی کے کئی سال کم کر دیئے ہیں۔

ضروری نہیں کہ میرا تجزیہ درست ہی ہو۔ مگر میرے نزدیک پاکستان کی یک جہتی پر یہ فیصلہ بھی ایک ضربِ کاری تھا۔ اس کے بعد دونوں بازوؤں میں محض فوجی سطح پر تعلق باقی رہ گیا اور درحقیقت اس کے اثرات افواج میں بھی شدت سے محسوس ہونے لگے۔ سول میں تو صورت حال یہ ہو گئی کہ مشرقی پاکستان کے منصوبے بنانے والے عموماً وہاں کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کر سکتے۔ اگر یہ لوگ مشرقی پاکستان جاتے بھی تو ان کے تجربات و مشاہدات ڈھاکہ کے ہوٹل اور اس کے گرد و نواح تک ہی محدود رہتے اور ڈھاکہ کی تکلّف و آسائش سے پُر عمارات مشرقی پاکستان کی تصویر بھلا کہاں کھینچ سکتی تھیں۔۔۔؟ اور پھر، یہ دونوں بازو ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ کٹ کر جدا ہو گئے۔ اس زخم کی کسک اگر آپ محسوس کرتے ہوئے اس کی نوعیت کو غور سے دیکھیں، تو لگانے والوں میں اپنوں کے ہاتھ بھی نظر آ جائیں گے ہ

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

حالات نے نئی کروٹ یہ لی کہ جو اصحاب مرکزی حکومت کے حلقۂ اقتدار تک رسائی رکھتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ مشرقی پاکستان سے تبادلہ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بے سہارا اور تنگرُم نہ جاننے والے خود کو حالات کی دلدل میں انتہائی بے بس پاتے۔ شکست کا احساس بھی بعض اوقات عجیب قسم کی قوتِ گویائی اور جرأت اظہار دے دیتا ہے۔ اسی جرأت کا بیگم عثمان نے مظاہرہ کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز گورنر ہاؤس میں دعوت تھی۔ منتظم حضرات نے گورنر ذاکر حسین صاحب کی میز پر مختلف مرتبہ کے دو عہدیدار اور چند بیگمات کو بٹھا دیا۔ اتفاق سے بیگم عثمان بھی ان ہی میں سے ایک تھیں۔ شیخ عثمان صاحب کا مغربی پاکستان کا تبادلہ ہو کر رک گیا تھا۔ یہ لوگ اپنا سامان بھیج چکے تھے اور ان کی بیگم تنگ آمد بجنگ آمد کے موڈ میں تھیں۔ گورنر صاحب ان سے ازراہِ اخلاق مخاطب ہوئے، اور کچھ اس انداز کی گفتگو ہوئی۔ "آپ کو بنگال پسند آیا؟" گورنر صاحب نے کچھ آگے جھک کر پوچھا۔ "یہئے یہ بھی کوئی پسند آنے والی چیز ہے، دلدل ہے دلدل۔ یہاں پھنسا ہوا کبھی کوئی نکل سکا ہے۔" حالانکہ ہم سب وہاں بہت ہی حسین دن گزار چکے تھے۔ مگر وہ بھری بیٹھی تھیں رویہ کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں "کرلو جو کچھ کرنا چاہو اس سے بڑھ کر اور کیا کرو گے۔ میں جی بھر کر جلی کٹی سناؤں گی"۔ ہم پاس بیٹھنے والے جواب سن کر دم بخود رہ گئے۔ کھانے میں ہلسا مچھلی تھی۔ ذاکر صاحب نے موضوع بدلا۔ "ہلسا مچھلی تو آپ کو پسند ہوگی"۔ وہ منہ بنا کر بولیں "افوہ، اس کی بدبو سے تو دماغ بھی سڑ جاتا ہے، یہ بھی کوئی پسند کرنے والی مچھلی ہے — ؟؟" ہلسا مچھلی کی باس بنگالی کی مرغوب خوشبو ہے۔ ہم سب گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ نہ جانے اب شیخ عثمان کا کیا حشر ہوگا؟ سب لوگ اپنے اندر خوف سے سکڑنے لگے۔ مگر گورنر صاحب

کا لطف و کرم جوش میں آگیا اور جلد ہی عثمان صاحب کے نیا دے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔ طبع شاہانہ کا سنتے آئے ہیں کہ

ہے بدشنامے خلعت وزد
طبیعت کی جولانی جو چاہے کر دکھائے

ان ہی دنوں ویسٹ انڈیز اور پاکستان کا کرکٹ میچ ڈھاکہ میں ہوا۔ گویا ہم سب کو اپنے خوف و تشویش کے خول سے باہر نکلنے کا موقعہ مل گیا۔ سب مغربی پاکستان کے دوستوں نے میچ کے ٹکٹ خریدے۔ دفتروں سے چھٹی لی اور اس طرح ہم سب میچ دیکھنے چلے۔ ہمارے گھروں سے اسٹیڈیم تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ مگر ہم میں سے کسی کے پاس سواری نہ تھی۔ لہٰذا درمیان سے اُٹھ کر دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آنے کا سوال تو پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہم سب لدے پھندے اس طرح اسٹیڈیم پہنچے کہ کھانا بھی اور چائے کے تھرماس بھی۔ چائے کے ساتھ کھانے کے سینڈوچز بھی ٹوکری کے کونے بھی رکھ لئے جاتے۔ علی الصبح جو جاتے تو شام ڈھلے سائیکل رکشا پر چرخ چوں کرتے ہوئے گھر پہنچتے۔ میچ تو پانچ دن کی بجائے تین دن میں ہی ختم ہو گیا۔ مگر اُن دنوں کی ہنگامہ پرور دلچسپیوں نے ہم سب کو خاصا تر و تازہ کر دیا۔ ہر وقت حالات پر قنوطانہ انداز میں تبصرہ کرنے سے دل و دماغ پر جو پھپھوندی سی لگ چکی تھی وہ کافی حد تک صاف ہو گئی۔ یہ معصوم سی تفریحات انسان کی ہمت و حوصلہ کو کس طرح جلا بخشتی ہیں۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔

حالات سے ذہنی طور پر سمجھوتہ کر لیا اور خود کو مصروف رکھنے کی مختلف ترکیبیں ذہن میں آئیں۔ عقلمندوں کا قول ہے کہ مسرور ترین لمحات وہ ہیں جب انسان اتنا مصروف ہو کہ اسے زندگی کی کلفتوں کا احساس ہی مٹ جائے۔ مجھے قانون پڑھنے کا شوق تو تھا ہی۔ میں نے بھی دانش مندوں کے اقوال زریں کی اندھا دھند تقلید کرتے ہوئے جھٹ

ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

قانون کے پہلے سال میں میرے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ مسز رحمٰن جو کہ ایک ملازمت پیشہ شوہر کی سیاستدان بیوی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ بظاہر نہایت گھریلو قسم کی خاتون نظر آتی تھیں۔ ان کے ملازمت پیشہ شوہر ہی ان کو سیاست میں لائے تھے اور وہی انہیں قانون پڑھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اکثر یونیورسٹی میں آکر ہم سے کہتیں: "آج تو آنے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر رحمان صاحب مصر تھے کہ کلاس کا حرج نہ کروں۔" اکثر بچوں کا سوئیٹر اور کوئی نا تمام چیز ساتھ لے آتیں اور وہیں آکر اسے مکمل کرنے میں لگ جاتیں۔

لیلیٰ (جس کا اپنا نام غالباً شمس النہار تھا) کے والد کسی چھوٹے ضلع میں وکالت کرتے تھے۔ لیلیٰ ایم اے کر چکی تھی مگر اسے سرکاری ملازمت نہ مل رہی تھی۔ یہ ایک جوشیلی لڑکی تھی۔ اس کے بقول وہ طالب علموں کے ایک وفد کے ساتھ جب سے چین گئی تھی کمیونسٹ کہلانے لگی تھی، حالانکہ وہ اس بات کی تردید کرتی رہتی۔ گورے رنگ کی گول مٹول سی موٹے شیشے کا چشمہ لگائے ہوئے لیلیٰ کی آنکھوں میں تجسّس بھرا رہتا۔ وہ اسٹوڈنٹ یونین کی سرگرم رکن تھیں۔

قانون کی کلاسوں میں کبھی باقاعدگی نہیں ہوتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ ہم تینوں باتیں کرتے کرتے تنگ آجاتیں تو معلوم ہوتا کہ کلاس نہیں ہوگی۔ سخت کوفت ہوتی۔ سب سے زیادہ اور پابندی سے کلاس لینے والے پروفیسر جن کا نام میں بھول گئی ہوں۔ اپنی زندگی میں بالکل لاپرواہ انسان تھے۔ ان کی قمیض کے کف و کالر سے ہمیشہ میل جھانکتی رہتی۔ جوتے کے تسمے بند رکھنے کا انہیں کبھی خیال نہ آیا اور ڈھیلی ڈھالی چھتر اسی لٹکتی ہوئی ٹائی اپنی ہستی کے لئے خود گالی لگنے لگتی۔ اپنی ان تمام بے نیازیوں کے باوجود نہایت شریف پروفیسر تھے۔

ایک روز لیلیٰ منتشر سانسوں کے ساتھ کلاس روم میں جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے داخل ہوئی۔ اپنی مخصوص سفید سوتی ساڑھی کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بیٹھتے ہی وہ پھٹ پڑی: "دیکھو نا! یہ سر بظاہر کتنے شریف و مسکین نظر آتے ہیں۔ مگر اندر سے کیسے گھنے ہیں" "کیا ہوا؟" میں نے ہنستے ہوئے دریافت کیا ــــ "ہونا کیا ہے۔ ابھی سر نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا" ــــ "تو کون سی آفت گئی" بظاہر میں نے سکون سے جواب دیا، مگر تجسس کے مارے بے چینی مجھے بھی ہو رہی تھی ــ "بھئی انہوں نے مجھے پرو پوز کر دیا" جیسے پھولے ہوئے غبارے سے پھُس سے ساری ہوا نکل جائے .... کھودا پہاڑ نکلا چوہا ــــ تو کیا ہوا لیلیٰ ــ یہ تو عین شریفانہ حرکت ہوئی نا" ــ میں نے اپنے تئیں معاملے کو رفع دفع کر دیا ــ مگر وہ غصے کے مارے بے قابو ہوئے جا رہی تھی۔ اور مجھے اپنے بے نیاز و خستہ حال پروفیسر پر خواہ مخواہ ترس آنے لگا۔ (بہت عرصہ کے بعد ڈھاکہ کے چینی سفارتخانہ میں ۱۹۷۱ء میں ایک تقریب کے سلسلے میں مجھے لیلیٰ ملی۔ وہ اب ایک کامیاب جرنلسٹ کی وکیل بیوی تھی اور تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ میں اسی خلوص کے ساتھ پرانی دوستی کی تجدید کے لئے اس کی طرف بڑھی۔ مگر اس کے چہرے پر دبا ہوا غصہ پھنپھنا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ اگر میں نے زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کی تو پروفیسر کی طرح مجھے بھی گالیاں دینے لگ جائے گی)

ہماری کلاس میں خاصے معمر حضرات بھی تھے اور کئی سرکاری عہدیدار بھی ــ مشرقی پاکستان کے سابق آئی جی پولیس مسٹر عبداللہ (جو ان دنوں افسر بکار خاص تھے، یعنی عتاب میں تھے) بھی آتے۔ سرکٹ ہاؤس میں ان کے برابر والے کمرہ میں ایک مرتبہ ہمارا قیام ہوا تھا۔ یہ مجرّد زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہت سی بلیّاں پال رکھی تھیں۔ ایک مرتبہ بڑے غصے میں کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور متنبہ کیا۔ "آپ کے بچے سے میری بلیاں ڈر رہی ہیں۔" میں انگشت بدنداں انہیں دیکھتی رہی۔ واقعی شفقت کے دھارے

بھی باپ بن کر ہی کھلتے ہیں ورنہ انسانی جبلتیں عجیب وغریب روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ کلاس میں بھی اُسی طنطنے سے آتے۔ اکثر ایسے سوال پوچھتے جو ان کی شخصیت و حیثیت کے منافی ہوتے۔

ہمارے گھر کے قریب ایک ایگزیکٹو انجینئر رہتے تھے۔ یہ میاں بیوی بھی خوب تھے میاں ملازمت کے ساتھ ساتھ قانون میں میرے کلاس فیلو تھے اور بیوی بچے پیدا کر کے انہیں پالتی اور دیگر گھرداری کے ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھتی۔ وہ کالج میں داخلہ لے کر بی اے کر رہی تھی اور میرے لئے یہ حیرت انگیز بات تھی۔

میں نے مشرقی پاکستان میں یہ رجحان بدرجۂ اتم دیکھا کہ اکثر لڑکیاں شادی کے وقت میٹرک بھی نہ ہوتیں مگر شادی کے بعد ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھتیں اور ایم اے اور ڈبل ایم اے کر لیتیں۔ اپنے یہاں تو یہی دیکھا تھا کہ ادھر شادی ہوئی اور اُدھر پڑھائی لکھائی ختم — فارغ اوقات میں خود کو اچھے کپڑوں اور میک اپ سے سنوارو، اور گپ بازی اور اسکینڈل سے لطف اٹھاؤ۔ حصولِ علم کا ذوق میں نے مشرقی پاکستان میں ہی دیکھا

عظیم پورہ کالونی کے پاس نیو مارکیٹ تھی جو جدید تقاضوں کے مطابق بنائی گئی تھی۔ جہاں گھریلو ضرورت کی ہر قسم کی چیزیں دستیاب تھیں۔ نیو مارکیٹ سے آگے فیل خانہ تھا۔ جہاں ہمارے کئی دوست احباب اپنے خوبصورت بنگلوں میں رہائش پذیر تھے۔ ہم شام کو اکثر ٹہلتے ہوئے وہاں چلے جاتے۔ ہمارے دوست کرنل قاضی ایسٹ پاکستان رائفلز میں تھے اور دس سال سے ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ یہ صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے اور نہایت ہی مہذّب لوگ تھے۔ گھر میں چھ ان کے اپنے بچے اور دو بہن کے بچے، یعنی کل آٹھ بچے رہتے تھے۔ مگر کیا مجال کہ غل غپاڑہ ہو۔ ہمیشہ سب بچے شائستگی سے کام میں یا اپنے وسیع وعریض لان میں کھیل میں مصروف ہوتے۔

یہ سب آپس میں پشتو بولتے اور ہمارے ساتھ اردو میں بات چیت کرتے۔ اتنے طویل عرصۂ قیام میں انہیں بنگالی کا ایک لفظ سیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان کے یہاں دوسرے فوجی افسروں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ میں نے نوٹ کیا کہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے افراد کو اپنے عہدے سے بہت زیادہ تنخواہ اور دوسری سہولتیں ملتی تھیں۔ لہٰذا وہ تین سال کی مقررہ میعادِ قیام کو بھی کم سمجھتے تھے اور وہاں کی مدّتِ قیام میں بہت خوش و خرّم تھے۔

ای۔ پی۔ آر کے علاوہ فوج کے دوسرے اراکین کو یہ تمام سہولتیں میسّر نہ تھیں۔ ہمارے فلیٹ کے قریب ہی میجر غیاث رہتے تھے۔ وہ خود تو یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی بیوی بنگالی خاتون تھیں اور مشرقی پاکستان کے ایک سینئر سیکرٹری مسٹر ثنا اللہ کی بیٹی تھیں۔ پچھواڑے کے فلیٹوں میں کیپٹن ڈاکٹر رحمت اور ان کے سامنے کیپٹن حلیم چودھری رہتے تھے۔ ان سب کی گزر اوقات کم و بیش ہماری ہی طرح تھی۔

مسز رحمت ایک زندہ دل خاتون تھیں اور چہرے بشرے اور گفتگو میں سراپا پنجابی تھیں۔ بنگالی کا ایک لفظ انہوں نے سیکھا ہوا تھا "تاڑا تاڑی" یعنی جلدی جلدی — جسے ہمیشہ وہ غلط بولتیں اور جب رکشا پر بیٹھ کر رکشا والے کو "توڑ د توڑ د چلو" کہتیں اور وہ انہیں متعجب نظروں سے دیکھتا تو مجھے بڑا لطف آتا۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک پارک بنا ہوا تھا۔ سب بچے شام کو وہاں فٹ بال کھیلتے۔ ہماری بلڈنگ کی نچلی منزل میں کیپٹن مسعود رہتے تھے۔ ان کے یہاں لاتعداد ہی بچے ہوتے۔ سب کے سب ان کے اپنے تو نہیں ہو سکتے۔ غالباً کچھ عزیزوں کے بھی ہوں گے۔ ان بچوں سے میرے بیٹے کی دوستی تھی۔ ایک بات عجیب سی لگتی تھی کہ شام کو میں بچے کو تیار کر کے کھیلنے کے لئے بھیجنے لگتی تو وہ جوتے نہ پہننے پر بضد رہتا اور کھیل سے واپسی پر جوتے عموماً اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوتے۔ ایک روز میرے ڈانٹنے

پر بسورتے ہوئے بولا: "میرے دوست کہتے ہیں کہ تم بڑے انگریز بنتے ہو۔ جوتے اور موزوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور امی! وہ سب تو ننگے پاؤں کھیلتے ہیں۔ میں کیوں جوتے پہنوں۔" مگر میں نے اس کی دلیل نہ مانتے ہوئے ڈانٹ دیا۔ اور ؎

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے
ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

کے مصداق روز اسے جوتے پہنا کر بھیجتی جسے وہ ہر روز ہاتھوں میں لے کر واپس آتا (بعض اوقات والدین بچوں کے مسائل نہ سمجھنے پر مصر ہوتے ہیں)

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

زندگی اچھے خاصے خوشگوار خطوط پر رواں دواں تھی کہ میرے شوہر کا میمن سنگھ تبادلہ ہو گیا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں ترقی کے لئے ایک لازمی شرط بنگالی امتحان پاس کرنا تھا۔ میرے شوہر نے کچھ جلدی ہی یہ امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس لئے ڈھاکہ اور تعلیم کو ادھورا چھوڑنے کا زیادہ افسوس نہ ہوا۔ مگر جب حسن ظہیر صاحب کے یہاں الوداعی کھانے پر دوستوں کی بیویوں نے جو بہنوں کی طرح عزیز ہو چکی تھیں مجھے اس طرح الوداع کہا جیسے کوئی میکے والے لڑکی کو وداع کر رہے ہوں تو فرطِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واقعی پرخلوص دوست دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں

ہم لوگ میمن سنگھ پہنچے تو ناظر صاحب سرکاری جیپ لے کر ہمیں لینے کے لئے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے (مشرقی پاکستان میں ناظر کا ادارہ سرکاری افسروں کے لئے

اجنبی جگہوں پر خاصی بڑی پناہ گاہ تھا) یہاں میرے شوہر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بن کر آئے تھے۔ مگر چونکہ ابھی سرکاری مکان جو اے۔ ڈی۔ ایم کے لئے مخصوص تھا خالی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا عارضی طور پر ہمیں ایک اور مکان الاٹ کر دیا گیا تھا۔ ناظر صاحب ہمیں اسی مکان پر لے آئے۔ یہ مکان اونچے پلیٹ فارم پر بنی ہوئی ایک ہندوانہ طرز کی ایک عمارت تھی۔ اپنے وقت میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ مگر اب در و دیوار سے بوسیدگی ٹپکتی تھی۔ عمارت کے عقب کی طرف نشیب میں ایک چھوٹا سا تالاب اور اس کے اردگرد ناریل اور سپاری کے اونچے پیڑ تھے۔ دو ناریل اور دس بارہ سپاری کے درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔ بنگال میں انسان رس دار فروٹ کے لئے ترس جاتا ہے۔ کچے ناریل جس کو ڈاب کہتے ہیں، رس دار فروٹ کا نعم البدل ہے۔ ڈاب کا پانی میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ پیڑ کے تنے کے ساتھ محبت سے لپٹے ہوئے سبز بڑے بڑے ڈاب دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ جب کہ سپاری کے نارنجی رنگ کے گچھے مجھے بالکل ہی بے معنی لگے۔ جب میں نے ملازموں کو ساری سپاری لے جانے کی اجازت دے دی تو انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میں واقعی منوں سپاری انہیں مفت میں بانٹ رہی ہوں۔ پان کھانے والوں کے لئے تو سپاری نعمت ہے۔ مگر نہ کھانے والوں کے لئے سوکھی لکڑی سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ واقعی ہر شے کی قدر قدر دان ہی سمجھ سکتا ہے ورنہ ہیرا بھی محض ایک شیشہ ہی ہے۔

بچوں کے لئے ایک ملازم ڈھاکہ سے ساتھ لائی تھی۔ یہ تیرہ چودہ برس کا شفیق نامی بہت محنتی لڑکا تھا۔ کھانا پکانے کے لئے ناظر صاحب نے ایک خانساماں کا بندوبست کر دیا۔ ہم صبح پہنچے تھے۔ دن بھر سونے کے کمروں کو جیسے تیسے کر کے ٹھیک کیا، اور کھانا پکانے کی اشیاء منگوائیں۔ رات کو تھک کر چور ہو کر ایسی سوئی کہ آنکھ کھلی تو سورج کی کرنیں کھڑکی میں سے آکر خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ساتھ والے پلنگ پر نظر پڑی

تو میرے شوہر سرخ آنکھیں کھولے ہوئے نہایت نڈھال لگ رہے تھے۔ بے ساختہ میرا ہاتھ ان کے ماتھے پر گیا۔ ماتھا آگ کی طرح جل رہا تھا۔ میں بستر سے یوں اچھلی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ "اوہ! آپ کب سے بخار میں پھک رہے ہیں۔" مجھے اپنے گھوڑے بیچ کر سونے پر ندامت ہونے لگی۔ اتنی صبح ڈاکٹر کو بلانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خود ہی بخار کم کرنے کی اٹکل پچّو دوائیں دیں۔ اللہ کا شکر ادا کیا جب دو گھنٹے کے بعد بخار کچھ کم ہونا شروع ہوا۔ اور یہ اس قابل ہوئے کہ دفتر جا کر چارج لیں۔ واپس آئے تو بخار پھر ہاتھ نہ لگانے دے رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے، اور پھر جو صبح، دوپہر، شام ڈاکٹر اور دوائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو آٹھ روز بعد میرے شوہر رو بصحت ہو گئے مگر دن رات کام سے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگ گیا۔

بہت سے مقامی لوگوں کے ساتھ پہلا تعارف اسی وقت ہوا جب وہ بیمار پرسی کے لئے آتے تھے۔ ہفتے عشرے کے بعد شب و روز میں باقاعدگی آنے لگی تو میں نے گھر کو ترتیب دیا۔ بچے کو پہلی مرتبہ ایک اچھا کانونٹ اسکول ملا۔ یوں تو کانونٹ سکولوں کی تعلیم کے، میں ہمیشہ خلاف رہی۔ مگر وہاں اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ باقی تمام سکولوں میں ذریعہ تعلیم بنگالی تھا۔ ویسے تو بچے بنگالی خوب بولتے تھے۔ مگر اردو انگریزی سے نابلد رکھ کر صرف بنگالی میں تعلیم کا آغاز ہمارے حالات میں مناسب نہ تھا۔ لہٰذا اس کانونٹ کو نعمتِ غیر مترکبہ سمجھ کر بچے کو اسی میں داخل کروا دیا۔

گھر اور بچے کی طرف سے اطمینان ہوا تو ہم نے گردو پیش کا جائزہ لیا اور سب سے پہلے ڈپٹی کمشنر کے گھر ملنے کے لئے گئے۔ مسٹر و مسز موسیٰ دونوں بہت وضعدار مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ چونکہ مغربی پاکستان میں ملازمت کے کئی سال گزار چکے تھے۔ لہٰذا ان کی عادات و اطوار میں مغربی اور مشرقی پاکستان کی روایات و اقدار خلط ملط ہو کر ایک حسین امتزاج پیدا کر رہی تھیں۔ رکھ رکھاؤ کے علاوہ شکل و صورت

کے اعتبار سے بھی یہ ایک خوبصورت جوڑا تھا۔ جب ہم پہنچے تو مسز موسیٰ ایک ریشمی ساڑھی میں ملبوس گھنگھریالے بالوں کو خوبصورتی سے پیچھے باندھے ہوئے مخصوص ہنسی کے ساتھ ہمیں لینے باہر برآمدے میں آئیں۔ ہم سب ان کے سلیقے سے آراستہ کئے گئے کشادہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو موسیٰ صاحب آستین اوپر چڑھائے معذرت کرتے ہوئے آئے۔ وہ صبح سے اپنے فریجریٹر کو مٹی کے تیل پر چلانے کی کوشش میں سرگرداں تھے (میمن سنگھ میں بجلی تھی مگر مخصوص اوقات میں آتی تھی۔ یعنی چوبیس گھنٹے بجلی میسر نہ تھی) دونوں میاں بیوی اتنی اچھی طرح ملے کہ ایک آدھ گھنٹے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں سے تعلقات ہوں۔ ہمیں رات کے کھانے کے لئے اصرار کر کے روکا۔ رات کو گھر واپسی پر نئی جگہ کی اجنبیت کافی حد تک دور ہو چکی تھی

میمن سنگھ نسبتاً ترقی یافتہ ضلع ہے۔ قدیم شہر کے ساتھ بہت سی پرانی روایات وابستہ ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہاں سڑکیں موجود تھیں اور ہمارے پاس جیپ تھی۔ مجھے سابقہ تجربات کے مقابلے میں یہ جگہ بہت جدید اور ترقی یافتہ لگی۔

ہمارے گھر کے بائیں جانب بالکل ملحقہ میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کا مکان تھا۔ ایک شب ایک بجے کا عمل ہو گا کہ ان کا ٹیلی فون آیا۔ بہت سخت پریشان تھے۔ فون پر ہی رونے دھونے رہے تھے۔ بولے "صاحب میں لٹ گیا۔ چور میرا سب کچھ لے گئے۔" میرے شوہر نے انہیں تسلی دی۔ اور چند لوگوں کو ٹیلی فون کر کے سو گئے۔ صبح جب ہم ان کے گھر گئے تو وہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میرے شوہر نے افسوس کیا اور پوچھا کتنے کا نقصان ہوا ہے۔ اس وقت تک وہ چوری کے سانحہ کے صدمہ سے خود کو سنبھال چکے تھے اور ان کے دل و دماغ پر عقل و ہوش کے ساتھ مصلحتِ حالات کا قبضہ تھا۔ فرمانے لگے "جی۔ وہ میری بہن کے سو روپے پڑے تھے۔ اور میرا پین یہاں رکھا تھا۔ یہ دونوں اشیا چوری ہو گئے۔"

"ارے آپ تو رات بہت پریشان تھے۔" میں نے اپنے شوہر سے پہلے ہی اپنا تجسس داغ دیا۔ "جی۔ غریب آدمی کے لئے یہ بھی بہت ہوتا ہے۔" حالانکہ وہ کسی طور غریب نظر نہیں آرہے تھے۔ ہم لوگ خاموشی سے واپس آگئے۔ دفتر میں متعلقہ مقامی لوگوں سے گفتگو کے بعد میرے شوہر نے مجھے آکر بتایا کہ وہ صاحب تو پولیس کے پاس بھی رپورٹ درج نہیں کروا رہے۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ واقعی ناجائز جمع کی ہوئی دولت اپنی ہوتے ہوئے بھی اعلانیہ اپنی نہیں ہوتی۔

کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد میرے شوہر کے عہدہ کے مطابق سرکاری مکان خالی ہو گیا۔ لہٰذا ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ یہ انگریزوں کے وقت کی بنی ہوئی عمارت تھی۔ وہی مخصوص نقشہ، وہی بڑے بڑے شیشے والے دروازے۔ کھڑکیوں کے بغیر بڑے بڑے روشندان والے بہت اونچی چھت کے کشادہ کمرے اور مکان کے ساتھ خوبصورت باغیچہ۔ چونکہ خوبصورت مکان تھا۔ لہٰذا آراستہ کرنے میں بھی بہت مزہ آیا۔ اس علاقے میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ بیشتر مکانات سرکاری، سول اور ملٹری عہدیداروں کے تھے۔ کچھ بنگلوں میں عیسائی مشنری رہتے تھے جو زیادہ تر سفید فام تھے دائیں طرف ایک یورپین پادری مقیم تھا۔ نہ جانے کیوں رات کی تاریکی میں کئی مرتبہ اپنا گھر بھول کر ہمارے یہاں آجاتا۔ ممکن ہے اس کی نظر خراب ہو یا پھر زیادہ پی کر بدحواس ہو جاتا ہو واللہ عالم بالصواب۔

ہمارے گھر کے سامنے سڑک کے اس پار ایک دو منزلہ بڑی سی عمارت تھی جو اپنی بلندی کے باعث اس علاقہ میں منفرد نظر آتی تھی۔ اس میں دوسرے اے۔ڈی۔ایم، رہا کرتے تھے۔ ان کا نام نورالغنی تھا۔ گہرے چاکلیٹی رنگ کے منحنی سے۔ چشمہ لگائے یہ صاحب خاصی مسمسی شخصیت کے حامل تھے۔ بالکل صاف گو نہ تھے۔ بلکہ ہر بات ہیر پھیر کر پُرمعنی انداز میں کرنے کے عادی تھے۔ یہ کرنل عثمانی کے جو بعد میں مکتی باہنی کے سربراہ

اور بنگلہ دیش کے وزیر بنے تھے ۔ بڑے بھائی تھے۔ اپنی ہندو بیوی اور اکلوتی ، اوسط سے کم عقل و فہم کی بچی کے ساتھ رہتے تھے اور ہم عہدہ ساتھیوں کے ساتھ کم ہی میل جول رکھتے تھے۔ مگر بکمال نوازش ہمارے یہاں کئی مرتبہ آئے۔ ان کی بیٹی جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی۔ لیکن ذہنی طور پر سات آٹھ سال کے بچے سے زیادہ نہ تھی مسز غنی اپنی ابتدائی زندگی میں سکول ٹیچر رہ چکی تھیں۔ اس لئے بچی کو خود ہی تھوڑی بہت تعلیم گھر میں ہی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مسز غنی کی شخصیت خاصی پُراسرار قسم کی تھی۔

ہمارے بائیں جانب ایک بڑی سی عمارت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ میں ڈویژنل فارسٹ آفیسر مسٹر چودھری رہتے تھے۔ دراز قامت و متناسب جسم کے چودھری صاحب اور ان کی گوری چٹی چھریرے بدن کی سرو قد بیگم جن کا ڈاک نام ، (یعنی پکارنے کا نام) بلبل تھا۔ واقعی بلبل کی طرح چہکتی رہتیں۔ یہ ایک بہت ذمہ دار گھریلو خاتون تھیں۔ گھریلو کام کاج کے علاوہ اپنے دو کمسن بچوں کو نہایت جانفشانی سے پڑھاتی تھیں۔ دونوں میاں بیوی نہ صرف جاذب و دلکش شخصیت کے مالک تھے بلکہ بہت سوشل بھی تھے۔

عمارت کے دوسرے حصے میں دو آرمی افسر رہتے تھے۔ یہ دونوں بال بچوں کے بغیر رہتے تھے۔ ایک کا نام کیپٹن اسد تھا اور دوسرے کا نام میجر شبیر، کیپٹن اسد ایسٹ پاکستان رائفلز کے افسر تھے۔ بڑے طرحدار قسم کے جوان جو خود کو مجرد بتاتے تھے۔ ان کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اگر اس حقیقت کا ذکر ان کے سامنے کیا جاتا تو بہت جھنجھلاتے۔ پنجاب کے کسی گاؤں سے تعلق تھا۔ میجر شبیر یوپی سے آئے ہوئے مغربی پاکستان میں سکونت پذیر، دراز قامت، سرخ و سفید، نہایت حسین شخصیت کے انسان تھے۔ اہل و عیال ہمراہ نہ تھے۔ ان کی بڑی بیٹی میری ہمنام تھی۔ اس کا ذکر اکثر میرے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ وہ ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والے شوہر تھے۔

ان دونوں افسروں کا کھانے پکانے کا ایک جا انتظام تھا۔ دونوں دوست بھی تھے۔ مگر میجر شبیر اکثر شاکی رہتے تھے کہ اگرچہ وہ دونوں پاکستان آرمی کے افسر ہیں مگر کیپٹن اسد ایسٹ پاکستان رائفلز میں ہونے کی وجہ سے ان سے جونیئر ہونے کے باوجود ان سے کہیں زیادہ تنخواہ اور دیگر سہولتوں کے حقدار ہیں۔ تنخواہ اور سہولتوں کی اس غیر مساوی تقسیم کو وہ ناانصافی کا نام دیتے اور کیپٹن اسد کو اکثر "بڑا آدمی" کہہ کر چھیڑتے۔

دو سو قدم کے فاصلے پر کیپٹن اسد وغیرہ کے گھر سے ذرا ہٹ کر عین لبِ دریا بہت خوبصورت بنگلہ تھا۔ اس میں میجر عباسی اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہت ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ میمن سنگھ کے ایسٹ پاکستان رائفلز کے سربراہ تھے۔ مری کے ذیلی علاقے کے رہنے والے سرخ و سفید میجر عباسی کی لمبائی اور چوڑائی میں زیادہ فرق نہ تھا۔ بہت ہنس مکھ، صاف گو اور سادہ فطرت کے انسان تھے۔ ان کی بیگم تعلیم نہ ہونے کے باوجود ایک سمجھدار خاتون تھیں۔ خلوص اور سادگی ہی ان کا حسن تھا۔

ایک طرف سیشن جج صاحب کا مکان تھا۔ بڑی پیاری فطرت کے بنگالی افسر تھے۔ ان کی بیگم زیادہ باہر نہ نکلتیں۔ مگر خود بہت بارونق شخصیت تھے۔ برج کے اتنے رسیا کہ کلب میں کھیلنے بیٹھتے تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا۔ گھر دیر سے لوٹنے پر بیگم انکے خوب لتے لیتیں۔ سب کو ان کی اس کمزوری کا علم تھا۔ اس موضوع پر ان سے خوب ہنسی مذاق چلتا۔ جسے وہ نہایت وقار سے سن کر ہنس دیتے۔

مقامی لوگوں میں اعظم صاحب سب سے زیادہ ہردلعزیز شخص تھے۔ چمکتے ہوئے سیاہ رنگ اور چوکور جسم کے بہت موٹے اعظم صاحب ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ انکا ڈاک نام ٹائینی تھا۔ جو ان کے بے اندازہ موٹے جسم کے ساتھ نہایت مضحکہ خیز لگتا۔ لیکن وہ اعظم کی بجائے "ٹائینی" ہی پکارے جاتے اور اسی نام سے زیادہ مانوس تھے۔ ان کی بہن مریم ہاشم الدین علاقے کی جانی پہچانی شخصیت تھیں۔ ان دنوں مرکزی اسمبلی کی ممبر بھی تھیں۔ یہ میمن سنگھ بہت

کم رہتیں۔ مگر اعظم صاحب ان کا ذکر بہت فخریہ انداز میں کرتے۔

مسز موسیٰ کے یہاں اپوا کی میٹنگ ہوتی رہتی۔ چونکہ بہت زیادہ خواتین ہوتیں اس لئے یہ میٹنگ باہر کے خوبصورت لان میں ہوا کرتی۔ میں اپوا کی ممبر ہونے کے ناطے سے شریک ہوا کرتی تھی۔ ہنسی مذاق اور گپ شپ میں کچھ وقت گزار کر یہ میٹنگ ختم ہو جایا کرتی تھی۔ ان میٹنگز میں مجھے مقامی خواتین سے راہ و رسم بڑھانے کا موقعہ ملا۔ بیشتر خواتین سوتی ساڑھیوں میں ملبوس بنگالی طرز کے جوڑے بنائے ہوئے سادگی سے آتیں۔ خواتین کے ان اجتماع میں تعمیری کام تو وہاں بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ مگر فیشن پریڈ کا سماں بھی میں نے کبھی نہ دیکھا۔ سادگی اور خالص بنگالی روایات کے امتزاج نے ان خواتین کی شخصیت کو مشرق کی عظمت بخشی ہوئی تھی۔ مغرب کی نقالی کی اضطراری تمازت کے مقابلے میں ان کا مقامی اقدار کا حامل بھاری بھرکم سکون مجھے ہمیشہ بہت پسند آیا۔ کئی خواتین کے گھروں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ بنگالی طرز کی سادہ بود و باش، کسی گھر میں بلند معیار زندگی کا جنون اس طرح حادی نہ دیکھا جو انسان کی اصلیت کے تانے بانے کو تہ و بالا کر کے رکھ دے۔

موسیٰ صاحب اور ان کی بیگم دونوں موسیقی کے دلدادہ تھے ——————
—————— ان کے یہاں اکثر موسیقی کی محفلیں جمتیں۔ مقامی موسیقار جمع ہو جاتے اور سر شام جو محفل کا آغاز ہوتا تو نصف شب تک مختلف راگنیوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ وہاں ہی مجھے مختلف راگنیوں کی شدھ بدھ ہوئی۔ موسیٰ صاحب کے دفتر کا ایک کلرک بہت اچھا کلاسیکل گانا گاتا۔ پتلا سا گہرے سانولے رنگ کا یہ فنکار ایک طرف گردن کر کے جب اونچی تان لگاتا تو اس کی گردن کی رگیں اس طرح پھول جاتیں کہ محسوس ہوتا جیسے بہت اذیت سے گزر رہا ہو۔

بظاہر اذیت کے ساتھ اس کی تان کا سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا کہ مجھے خواہ

مخواہ ترس آنے لگتا۔ مگر ہر محفل موسیقی میں وہ ضرور شریک ہوتا اور اسی شد و مد اور لگن کے ساتھ راگ سناتا۔ ایک دبلی پتلی سی بدصورت نوجوان لڑکی مالکوس اتنا اچھا گاتی کہ گاتے ہوئے حسین لگنے لگتی۔ اس کی مترنم آواز کی بدولت مجھے مالکوس سب راگوں سے زیادہ دل کش لگنے لگا۔ مقامی فنکاروں کے علاوہ اکثر مہمان خود بھی گانا سناتے۔ موسیقی کی یہ محفلیں بعض اوقات اتنی طویل ہو جاتیں کہ نیند کے مارے بُرا حال ہو جاتا اور مروت کے مارے بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا۔

موسیٰ صاحب کے بیٹے کا نام میشا اور بیٹی کا نام میتا تھا (یہ ڈاک نام تھے) میشا اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور ذہین بچہ تھا اور میتا گول مٹول سی معصوم بچی تھی۔ یہ اپنی معصومیت میں ایسی بے ساختہ باتیں کہہ دیتی کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ میرے بیٹے کی ان دونوں کے ساتھ دوستی تھی۔ میری ننھی بچی کی مخصوص عادات تھیں۔ وہ دن بھر گھر میں کھیلتی رہتی اور شام کو بڑے اہتمام سے تیار ہو کر اپنے نوکر کی انگلی تھامے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی چھتری تھامے، دریا کے کنارے کنارے دُور تک سیر کو نکل جاتی۔ دو ڈھائی برس کی بچی کی یہ سیر سب میں مشہور تھی۔ لطف کی بات یہ کہ ہماری بچی اُردو کی بجائے بنگالی میں ہی گفتگو کرتی۔ بنگالی ہی میں کہانیاں اِدھر اُدھر کی باتیں سناتی۔ مسور کی دال اور بھات اس کا محبوب ترین کھانا تھا۔ اب جب وہ بنگالی کی ابجد بھی بھول چکی ہے تو یہ باتیں بہت تعجب سے سنتی ہے۔

ان دنوں میرے شوہر کے علاوہ ضلع کی انتظامیہ کے تمام افراد بنگالی تھے۔ مگر کبھی یہ چیز محسوس نہیں ہوئی۔ ہم مختلف صوبوں کے باشندے ہونے کے باوجود ایک وطن کے شیدائی تھے۔ زبان و سیاست کی بنا پر اغیار جو کھائی کھود رہے تھے۔ ابھی اتنی گہری نہ ہوئی تھی کہ ہماری یک جہتی کو متاثر کرتی۔ شام کو میرے شوہر اور موسیٰ صاحب ٹینس کھیلتے تو میں اور مسز موسیٰ بلیرڈ روم میں جا کر گھنٹوں بلیرڈ میں گم رہتیں

اکثر یہ لوگ اپنے کھیل سے فارغ ہو کر بلیرڈ روم ہی میں آجایا کرتے اور پھر دوستانہ مقابلے شروع ہو جاتے جو ہمیشہ ہی ہم ہارتے۔ ہمیں صحیح زاویہ سے گیند کو جائے مقصود کی طرف دھکیلنا کبھی آیا۔ خواہ بلیرڈ کی میز ہو یا زندگی کی بازی — زندگی کے اس مقام پر نہ جانے اس کا احساس کیوں بڑھ گیا ہے۔

ایک روز معلوم ہوا کہ حبیب الرحمٰن انتظامیہ سے عدلیہ میں آگئے ہیں اور ان کا تبادلہ مین سنگھ ہو گیا ہے۔ پھر ایک دن وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ اسی مکان میں آ گئے، جس میں پہلے ڈیڑھ ماہ ہم رہ چکے تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں بالآخر اپنی پسند کی لڑکی مل گئی۔ خوشی کے مارے دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ شام کو میں ان کے گھر گئی ان کی دلہن شمیم، کامنی سی، بہت پیاری لڑکی تھی۔ ابھی بی اے میں پڑھ رہی تھی کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے شادی کر دی گئی۔ لڑکی جو امیر خسرو کے زمانہ میں بابل کی گائے تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہی رہی۔

ان ہی دنوں کلب میں فینسی ڈریس شو منعقد ہوا۔ سب ہی نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ میرے شوہر پنجاب کے جاٹ بنے اور میں نے پنجاب کی دیہاتی عورت کا لباس پہن کر، گھڑا کولہے پر ٹکا لیا۔ شمیم ایرانی لڑکی کے روپ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ جب ہم کلب میں پہنچے تو دیکھا کہ ہم لوگوں نے تو محض خانہ پُری کی ہوئی تھی۔ دوسروں نے اس محنت سے روپ بھرا ہوا تھا کہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک پٹھان بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتا ہوا اور ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ آتے ہی اس نے ڈبیا کھولی اور خاص انداز سے نسوار منہ میں ڈالی۔ بہت دیر کے بعد پہچان پائے کہ وہ میجر عباسی تھے۔ ایک ہندو سادھو، سر کے ایک طرف بالوں کی لٹ، ماتھے پر بڑا سا چندن لگائے گیروے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہاتھ جوڑتا ہوا آیا اور سر کو جھکائے

ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ سب نے بوجھنے کی کوشش کی مگر آخر تک، نہ بوجھ پائے کہ وہ سیشن جج صاحب تھے۔ عربی لباس میں ایک صاحب چشمہ لگائے اندر آئے۔ یہ موسیٰ صاحب تھے۔ نوجوان سپیرا اور سپیرن آئے۔ یہ بجائے سانپ کی پٹاری اٹھانے کے منکے اور کوڑیاں بیچ رہے تھے۔ سامنے ہی کپڑا بچھا کر انہوں نے چیزیں بکھیریں اور چٹاگانگ کی خاص بولی میں آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ بڑی مشکل سے سمجھ پائے کہ وہ چودھری صاحب اور بلبل تھے۔ باقی سب نے بھی تھوڑا بہت بہروپ بھرا کہ اس روز اس کے بغیر کلب میں داخلہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ مگر ان لوگوں کی کاملیت کو کوئی نہ پہچان سکا۔ انعامات کے حقدار بھی یہی لوگ قرار پائے۔

اچانک خبر ملی کہ موسیٰ صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ پھر جب پتہ چلا کہ ان کی بجائے کاظمی صاحب ڈپٹی کمشنر بن کر آ رہے ہیں تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ کاظمی صاحب اور حمیدہ کے آنے سے میمن سنگھ میں قوس و قزح کے سارے رنگ بھر گئے۔ ہم انہیں پہلے کاظمی بھائی کہتے تھے اور اس تعلق میں نئی صورتِ حالات سے کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بھائی کی شفقت کے ساتھ ہماری بھلائی کا سوچتے اور برادرانہ خلوص سے ہی غلطیوں پر ڈانٹتے۔

کاظمی بھائی کیا آئے میمن سنگھ مشرقی پاکستان کا لاہور بن گیا۔ پہلے نور الغنی صاحب کا تبادلہ ہوا اور ان کی جگہ دو نئے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر آئے۔ نور الغنی صاحب کے مکان کی اوپر نیچے کی منزلیں دونوں نئے افسروں میں تقسیم ہو گئیں۔ اوپر کے حصے میں اسلم اقبال اور نیچے کے حصے میں شعیب سلطان رہنے لگے۔ تھوڑے دنوں کے بعد تین زیر تربیت افسر لاہور سے انتظامیہ میں تربیت لینے کی غرض سے وہاں بھیج دیئے گئے۔ حمیدہ اور کاظمی بھائی کے ساتھ ہم نے جو تین ماہ میمن سنگھ میں گزارے۔ ان کی حسین یاد آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ کاظمی بھائی کی اضطراری طبیعت اور حمیدہ

کے فطری پُرسکون ٹھہراؤ نے اس جوڑے کو اتنی دل کش اکائی بنا دیا تھا کہ ہم سب مقناطیسی انداز میں ان کی طرف کھنچنے لگے تھے۔

کاظمی بھائی کی شخصیت کے تمام پہلو بہت دلچسپ تھے۔ دن بھر دفتر میں جان توڑ کر کام کرتے اور دوسروں سے کام لیتے۔ جب شام کو ہم سب کلب میں جمع ہو جاتے تو یوں لگتا جیسے ایک خاندان کے سب افراد اکٹھے ہو گئے ہوں۔ بے ہنگم زندگی شروع ہو جاتی۔ گھنٹوں رمی کھیلتے۔ گپ چلتی۔ کلب ہمارا دوسرا گھر بن چکا تھا۔ یہاں تک کہ رات کا کھانا بھی ہم نے وہیں کھانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھار مغربی پاکستان کے تبادلہ کا موضوع زیر بحث آ جاتا۔ تو سب کے چہروں پر بے بسی کھنڈ جاتی۔ کیوں کہ ابھی تک ان سب کا مستقبل فضا میں معلق تھا اور مرکزی حکومت کی طرف سے ان کے متعلق کوئی واضح پالیسی عمل میں نہ آئی تھی۔ مگر فوراً ہی " ہا ہو " کے شور میں اس بے بسی کے احساس کو دفن کر دیا جاتا۔ کاظمی بھائی نے کئی مرتبہ حکم دیا کہ گیارہ بجے کے بعد کلب بند ہو جائے گا اور ہمیشہ اپنے حکم کی خود ہی خلاف ورزی کی۔ بنگال کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور غیر یقینی مستقبل سے آنکھیں چرا کر ہم سب اپنی زندگی میں مگن ہونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہم سب جو بعد میں منتشر ہو کر ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے ان دنوں ایک خاندان بن گئے تھے۔ جس کا ہر فرد ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر کا شریک تھا۔

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

روز و شب ایک طویل پکنک کی طرح گزر رہے تھے کہ میرے شوہر کے تبادلے کے احکامات آگئے۔ بوگرا کے ڈپٹی کمشنر ہو کر جا رہے تھے۔ شوہر کے عہدے میں ترقی کی خوشی بھی تھی مگر اتنے پیارے دوستوں سے جدا ہونے کا افسوس اس سے بھی زیادہ تھا۔ لیکن نوکری تو بہرحال نوکری ہوئی۔ خواہ کسی مقام پر ہو۔ اور پھر ہم جیسے لوگوں کی ملازمت جو ہوں ہی حکم کے بندے۔ چپکے سے بوریا بستر سمیٹا اور میمن سنگھ کی بہاروں کو خیر باد کہہ کر بوگرا روانہ ہو گئے۔

بوگرا جانے کے لئے کئی ذرائع آمد و رفت استعمال کرنا پڑے۔ میمن سنگھ سے ٹرین لے کر بہادر آباد گھاٹ پہنچے۔ وہاں سے اسٹیمر کے ذریعے پھل چھڑی گھاٹ گئے اور وہاں سے پھر ریل کے ذریعے بوگرا پہنچے۔ اسٹیشن سے سیدھے سرکٹ ہاؤس آگئے۔ پہلے دو

ڈپٹی کمشنر ابھی اس گھر میں مقیم تھے اور فی الحال ان کا ارادہ گھر خالی کرنے کا نہ لگتا تھا۔

میری طبیعت میمن سنگھ سے ہی خراب تھی۔ سرکٹ ہاؤس میں پورا مہینہ گزارنا پڑا۔ زیادہ تر وقت میں پلنگ پر ہی گزارتی۔ بچے کے سکول کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جتنے بھی سکول ہیں سب میں ذریعہ تعلیم صرف بنگالی ہے۔ لیجئے! بچے کی تعلیم کا سلسلہ تو بالکل ختم ہو گیا۔ ان سب باتوں نے مل کر مجھے خاصا چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بنگالی غیر بنگالی کا مسئلہ جنم لے چکا تھا۔ غیریت کے مبہم سائے ہلکے سے لہرا رہے تھے۔ پہلے والے ڈپٹی کمشنر بتائے بغیر کہ کب مکان خالی کریں گے ڈھاکہ چلے گئے تھے اور میں جو چوآڈانگہ اور مانک گنج جیسی جگہوں میں خوشی خوشی رہی تھی۔ اس اجنبیت سے بوجھل ہوتی ہوئی فضا میں پہلی مرتبہ رو دی۔

کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد خدا خدا کر کے ڈپٹی کمشنر ہاؤس خالی ہوا اور ہم نے اپنے گھر میں قدم رکھا۔ اپنا گھر کتنی بڑی پناہ گاہ ہوتا ہے۔ خواہ کہیں ہو۔ اپنا گھر جنت ہے اپنے گھر میں آنے کی خوشی کی حرارت سے قنوطیت اور افسردگی کے بادل یوں چھٹ گئے جیسے ہوا آناً فاناً ابر پاروں کو اڑا کر لے جاتی ہے۔

نسبتاً اونچائی پر عین دریائے کروتوا کے کنارے پر ایک بہت خوبصورت مکان تھا۔ پرانی وضع کی شاندار عمارت میں جدید سہولتوں کی موجودگی نے اسے واقعی شاہانہ بنا دیا تھا۔

بنگلے کے عقب کے برآمدے سے دریا کا نظارہ رُوح پرور تھا۔ نہ جانے اس دریا میں کتنی مچھلی تھی کہ چوبیس گھنٹے بڑے بڑے جال لگے رہتے اور مچھلی پکڑی جاتی۔ ان مچھیروں نے گورنمنٹ سے دریا سے مچھلی پکڑنے کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا۔ وہ ہر سائز کی مچھلی پکڑ لیتے۔ حتیٰ کہ ننھی مچھلیاں بھی ان کے جال سے بچ کر نہ جا سکتیں۔ ہمارے تین ملازم ہر روز آٹھ دس آنے کی مچھلی سامنے سے خرید لاتے اور اسی ماچھ کے ساتھ

بھات ملا کر کھاتے۔ ایک روز میں نے خانساماں کو پکاتے ہوئے دیکھا۔ میرے خیال میں کوئی سو ننھی ننھی مچھلیاں تھیں۔ اس نے بغیر صاف کئے آنکھوں سمیت ساری مچھلیوں کو تیل کے بگھار پر ڈال کر شوربہ بنالیا۔ مجھے ابکائی سی ہونے لگی۔ یا اللہ کسطرح یہ سب کھالیں گے؟ لیکن وہ روزانہ یہی کھانا کھاتے اور بہت رغبت سے کھاتے مختلف جگہوں پر مزے اور رغبت کے معیار بھی قدرت نے کتنے مختلف بنائے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ولایت میں ایک روز میری لینڈ لیڈی نے اپنی بنائی ہوئی کوفتوں کی طرح ایک ڈش مجھے نہایت شوق سے دی تھی۔ منہ میں بغیر نمک مرچ کے نہایت بدمزہ کوفتہ رکھتے ہی میں کمرے کی طرف بھاگی تاکہ اسے کوڑے والی ٹوکری میں اُگل سکوں۔

ہمارے مکان کے بائیں جانب سامنے سول سرجن چودھری صاحب کا گھر تھا۔ سفید لہردار بالوں والے ہنس مکھ چودھری صاحب اور ان کی نہایت سلجھی ہوئی طبیعت کی متناسب جسم اور بُوٹے سے قد کی بیگم بہت ملنسار لوگ تھے۔ اپنی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ نہایت خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ تھوڑی دور پر ایس، پی ابوالاوّل صاحب کا مکان تھا۔ دُبلے پتلے سے اوّل صاحب بہت شوقین مزاج واقع ہوئے تھے۔ انہیں اُوپر سے "رائے" دی گئی تھی کہ بیوی بچے ساتھ رکھیں کہ اہل و عیال کردار کے سنبھلنے میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں سننے میں آتی تھیں۔ حالانکہ مجھے وہ کسی طور پر کمزور کردار کے مالک نہ لگتے تھے اور کم از کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ وہ اپنی صاف رنگ کی گول مٹول سی بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ بطور انسان تو وہ مجھے بہت پسند آئے۔ صاف گو، پُر خلوص اور دوست نواز۔

ڈاکٹر صاحب کے بچے صبح سکول جانے کے لئے سامنے سے گزرتے تو میں انہیں حسرت کی نظر سے دیکھتی اور اپنے بچے کو خود ہی پڑھانے بیٹھ جاتی۔ مسز چودھری نے ایک ماسٹر کا بندوبست کر کے دیا۔ طے یہ پایا کہ وہ حساب اور انگریزی پڑھائیں

گے۔ ایک روز جب وہ پڑھا رہے تھے تو میں کمرے میں چلی گئی۔ وہ گا گا کر اے۔ بی۔ سی پڑھ رہے تھے اور میرا بچہ اسی طرح بغیر دیکھے پیچھے پیچھے دہرا رہا تھا۔ میں نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے ان سے پوچھا: "ماسٹر صاحب! یہ کیا طریقہ ہے پڑھانے کا۔" بڑی معصومیت سے بولے "کنڈرگارٹن کے بچوں کو انگریزی ایسے ہی پڑھاتے ہیں۔" اور میری طرف مسکرا کر یوں دیکھنے لگا جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں "تم نادان انگریزی پڑھانے کے طریقے کیا جانو۔" بچہ دوسری تیسری جماعت کی پڑھائی کر رہا تھا انگریزی معیارِ تعلیم والے ماسٹر صاحب کو رخصت کیا اور میں نے خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ احساس کہ بچہ تعلیم میں اپنے ہم عمروں سے بہت پیچھے ہے۔ میرے لئے مستقل سوہانِ روح تھا۔

ایک شام گوہر علی صاحب مع اپنی بیگم ملنے آئے۔ ان کا تبادلہ یہاں ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ چوآڈانگا میں ایک سال گزرا تھا اور وہاں کی یاد ان دونوں میاں بیوی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ بہت دلچسپ لوگ تھے۔ گھنٹوں گُشتیہ کے قصّے مزے لے لے کر سناتے۔ گوہر علی کے آنے سے ہماری برج پارٹی جمنے لگی۔ شام کو سول سرجن چودھری صاحب بھی آجاتے اور ہم ایک دو گھنٹے کھیل میں گزار دیتے۔

برگرہ میں جمیل انڈسٹریز تھیں۔ پانچ بھائی ان صنعتوں کے مالک تھے۔ وہاں ان کی سگریٹ اور صابن بنانے کی فیکٹریاں تھیں۔ سگریٹ بنانے کی فیکٹری کے مینیجر لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور دو جوان بچوں کے ساتھ فیکٹری کے قریب ایک نئی تعمیر کردہ عمارت میں رہ رہے تھے۔ بوگرا میں یہ اردو بولنے والا واحد خاندان تھا جسے ہم جانتے تھے۔ ان کے گھر جا کر عجیب قسم کا سکون ملتا۔ جیسے لق و دق صحرا میں چلتے چلتے کسی سایہ دار درخت کا سایہ میسّر آجائے۔

ایک صنعت کار بھنڈاری صاحب تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خود تو تعلیم حاصل

نہیں کر سکے ۔ مگر بیٹوں کو بہترین تعلیم دلانے کا بندوبست کر رہے تھے۔ ان کے دو بیٹے انگلینڈ کے بہترین سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ پرانی طرز کا مکان تھا۔ پہلے ڈیوڑھی ، پھر صحن اور صحن کے گرد گرد رہائشی کمرے۔ ڈیوڑھی میں بھنڈاری صاحب دیگوں کے پاس بیٹھے چاول نکال کر کھانے کے لئے اندر بھیج رہے تھے۔ ململ کی دھوتی اور کرتے میں ملبوس۔ بھنڈاری صاحب وہاں کے سیٹھ تھے۔ مگر دلہن زیور سے لدی ہوئی نہ تھی۔ مناسب ہلکا سا زیور کا سیٹ سادگی سے مانگ نکال کر بڑا سا جوڑا بنا دیا گیا تھا اور مانگ میں سندور اور ماتھے پر سرخ بندیا سہاگ کی نشانی کے طور پر سجا دی گئی تھیں۔ مہمان خواتین کے لباس اس قدر زرق برق نہ تھے جتنے کہ میں اپنے یہاں کی شادیوں میں دیکھنے کی عادی ہوں۔ شادی کی رسومات کم وبیش وہی تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ صرف فرق یہ تھا کہ گیتوں کی اس سرزمین میں شادی پر گیت نہ گائے گئے۔ جس کی تشنگی رہی۔

بوگرا کا نام آتے ہی محمد علی بوگرا پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم کا نام ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ نوابان بوگرا کی تاریخ صدیوں پرانی تھی۔ جائیداد کی تقسیم کے لحاظ سے اب یہ خاندان دو حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ محمد علی کا خاندان اپنے اصلی نام یعنی "نواب خاندان" کے نام سے مشہور تھا اور ان کا مکان "نواب باڑی" کے نام سے مشہور تھا۔ دوسرا گھرانہ جو کہ جائیداد میں سات آنے کا حصہ دار تھا "سات آنی باڑی" والے کہلاتے تھے۔ حبیب الرحمٰن صاحب جو مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم رہ چکے تھے، اسی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔

محمد علی صاحب کا محل نما مکان بوگرا میں شان وشوکت اور بیش قیمت آرائشی سامان اور قدیم نوادرات کے لحاظ سے دیکھنے والی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ایک روز میں یونہی گھومتی ہوئی محل کے احاطہ میں چلی گئی۔ ان کا گونگا دربان مجھے ایک بڑے حوض

کے پاس لے گیا۔ اس میں محمد علی صاحب نے مگرمچھ کا ایک بچہ پال رکھا تھا۔ جوں ہی میں قریب گئی مگرمچھ نے اتنے زور سے سانس اندر کھینچی کہ مجھے محسوس ہوا کہ اس سانس کے ساتھ میں خود کھینچی چلی جاؤں گی۔ میں پیچھے ہو گئی۔ سنا تھا کہ مگرمچھ کی سانس میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ مچھلیاں اگر اس کی سانس کی زد میں آجائیں تو خود بخود اس کے منہ میں چلی جاتی ہیں مگرمچھ بچے نے ثابت کر دیا کہ اس میں کتنی زیادہ حقیقت ہے۔

محمد علی صاحب ان دنوں جاپان میں پاکستان کے متعین سفیر تھے۔ ان کی بیگم ایک ہفتہ کے لئے بوگرا آئیں۔ ازراہِ لطف و کرم میرے ہاں بھی تشریف لائیں اور دوسرے دن کے لئے مجھے مدعو کر گئیں۔ وقتِ مقررہ پر میں "نواب باڑی" گئی۔ عجیب نظارہ دیکھا سیڑھیوں کے دونوں طرف ہر سیڑھی پر نئے و پرانے تمام ملازمین باقاعدہ وردیوں میں ملبوس کھڑے تھے۔ جب میں ہال میں پہنچی تو بیگم محمد علی بڑی تمکنت سے آگے بڑھیں ان کی تمام حرکات و سکنات "بڑے آدمی" ہونے کی مظہر تھیں اور ہر قول و فعل سے دولت و ثروت ٹپکتی تھی۔ زندگی کے اس بلند مقام پر پہنچ کر ان کا ان سطحی چیزوں کا سہارا لینا عجیب سا لگا اور یک دم مجھے اپنی بے مائیگی پر پیار آنے لگا۔ وہ ایک دلکش شخصیت کی مالک، ملنسار خاتون تھیں۔ شاید اپنے آبائی شہر سے دور ایک طویل عرصہ قیام نے ان کے اندر یہ خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ ورنہ ایک بنگالی تو اپنی روایات کا پروانہ ہوتا ہے۔

ہمارے گھر کے ملازمین سب بنگالی تھے۔ جیپ کے ڈرائیور کا نام کریم تھا۔ میری ننھی بچی اسے ہمیشہ نہایت سنجیدگی سے موٹر کی کریم کہتی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا کریم نمازی اور بہت ذمہ دار انسان تھا۔ وہ موٹر چلانے کے علاوہ مالیوں سے بھی کام لیتا۔ لیچیوں سے لدے ہوئے پیڑوں پر ٹین اس طرح باندھتا کہ مالی اسے بجاتا رہے اور چمگادڑ لیچیاں نہ کھا جائیں۔ ورنہ چیل جتنے بڑے بڑے اتنے بہت سے چمگادڑ

ایک بھی نہ چھوڑتے۔ وہ تمام ملازمین میں سب سے زیادہ سمجھدار اور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ لہٰذا گھر کے سودا سلف اور دیگر باہر کی ذمہ داریاں رفتہ رفتہ اُس نے اپنے ذمّہ لے لیں۔ مجید خانساماں چھوٹے قد کا سیاہ منحنی سا انسان تھا۔ کھانا تو کبھی ڈھنگ سے نہ بناتا۔ مگر تھا ایماندار۔ خالی وقت میں باورچی خانہ کے باہر دریا کی جانب ٹانگیں پھیلائے بیٹھ کر مانجھیوں کا گیت گانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔

ان ہی دنوں جنرل اعظم دورے پر آئے۔ جنرل صاحب ہر دلعزیز تھے بھی اور انہیں ہر دل عزیز ہونے کا شوق بھی تھا۔ وہ ایک ہی شخص سے جب بھی سامنے آتا کئی مرتبہ ہاتھ ملاتے اور اجنبی کی طرح سلام کرتے۔ ایک تقریب میں مجھ سے تین مرتبہ علیک سلیک ہوئی۔ اسٹیج پر ورائٹی پروگرام ہو رہا تھا کہ وہاں کی خاطر و مدارات کا ایک لازمی جزو تھا۔ میں قریب ہی بیٹھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جنرل صاحب کچھ دلچسپی نہیں لے رہے۔ پھر وہ یک دم چونکے، اسٹیج کی طرف نظر کی اور ایک ہزار کے انعام کا اعلان کر کے اُٹھ گئے۔

بوگرا فن کاروں کا شہر تھا۔ جب بھی کسی تقریب کے لئے فنکاروں کا انتخاب کرنا ہوتا۔ شہر کی مختلف پارٹیوں کو جن کا تعلق عموماً سکولوں سے ہوتا، اطلاع بھیج دی جاتی۔ فن کار لڑکے اور لڑکیاں ہمارے ہاں جمع ہو جاتے اُدھر ایک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔ اکثر نہایت نمازی اور پرہیزگار حضرات اپنی صاحبزادیوں کو ساتھ لے کر آتے اور شوق سے فن کا مظاہرہ کرواتے۔ ہندو مذہب کے اثر نے گانے اور ناچ کو عبادت کا تقدّس بخش دیا تھا اور ایمانی بات ہے کہ میں نے کبھی وہاں کسی محفلِ رقص و موسیقی میں سُوقیت کا عنصر نہ پایا۔

حِصّہ دوّم

○

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد (اقبالؔ)

زندگی حسبِ معمول اپنے ڈگر پر رواں دواں تھی کہ خبر اڑی کہ مغربی پاکستانی افسروں کا واپس تبادلہ ہو رہا ہے۔ اب تک یاسیت کی چادر اتنی دبیز ہو چکی تھی کہ غیر محسوس طور پر مزاج کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔ سوچا کہ یہ بھی پہلے کی طرح ایک افواہ ہوگی۔ ایسی افواہیں کئی مرتبہ اڑیں اور اپنی موت آپ ختم ہوگئیں۔ مگر احساسات کے ساکن جوہڑ پر یہ خبر زور سے پھینکی ہوئی ایسی کنکری ثابت ہوئی کہ اس نے ہلچل مچادی۔ سب نے ایک دوسرے سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ بہت لمبے چوڑے پروگرام بنائے گئے کہ اس خبر کے سچ ہونے کی صورت میں سب اپنی موٹروں میں جلوس کی شکل میں براستہ بھارت مغربی پاکستان جائیں گے۔ یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ مگر جب واقعی اس متن کے احکامات جاری ہوئے تو کسی نے اِدھر اُدھر نہ دیکھا۔ فوراً اپنی اپنی ڈیوٹی

کا چارج دیا۔ اور جلد سے جلد مغربی پاکستان پہنچنے کی سبیل سوچی، مبادا کہ حکومت یہ احکامات منسوخ نہ کر دے۔ ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ "جہاز پر بیٹھ کر بھی مجھے یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں آرڈر منسوخ نہ ہو جائے، اور مجھے واپس نہ اتار لیں۔"

سبھی دوست بذریعہ ہوائی جہاز مغربی پاکستان آئے۔ مگر مجھے ہمیشہ بحری سفر پسند رہا ہے۔ میں نے اصرار کر کے اپنے شوہر کو منا لیا کہ ہم لوگ چٹاگانگ سے بحری جہاز کے ذریعے جائیں گے۔ گو جولائی میں مون سون کی وجہ سے خلیج بنگال بپھری ہوئی شیرنی ہوتی ہے اور سب نے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر ہم نے "شمس" میں سیٹیں بک کروالیں۔

"شمس" جہاز ان ہی دنوں نیا نیا جاپان سے خریدا گیا تھا۔ اس کا غالباً یہ پہلا پھیرا تھا۔ ہر چیز نئی نویلی دلہن کی سی چکیلی سج دھج لئے ہوئے تھی۔ چونکہ تمام سٹاف نیا تھا لہٰذا کھانے اور دیگر رکھ رکھاؤ کا معیار بہت بلند تھا۔ رات کے بارہ بجے ہم سری لنکا کی بندرگاہ کولمبو پہنچے۔ پانچ گھنٹے کے لئے جہاز لنگر انداز ہوا تھا۔ لہٰذا رات کو ہی ہم شہر دیکھنے کی غرض سے خشکی پر چلے گئے۔ ابھی تک بازار میں بیشتر دکانیں کھلی ہوئی تھیں بندرگاہ پر اس قدر روشنی تھی کہ دن کا گمان ہو رہا تھا۔ رات کے چند گھنٹوں میں جس حد تک کوئی شہر دیکھا جا سکتا تھا ہم نے دیکھا۔ مگر لطف شب میں سیلون کا ریڈیو سٹیشن دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہی۔

کراچی آیا ـــــ جذبات کی شدت سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے بنگالی میں بات کرنے کی اس قدر عادت ہو چکی تھی کہ بندرگاہ کے مزدور کو جب میں نے ہدایات بنگالی میں دیں اور اس نے اردو میں مجھ سے مدعا دریافت کیا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خوشگوار تبدیلی کو کیا نام دوں۔ یعنی یہ کہ اب ہر ہر لفظ مجھے بغیر ذہن پر زور

دیئے سمجھ میں آئے گا — اور — اب تو مزدوروں سے بھی ۔۔۔ ہر ایک سے خوب کھل کر اپنی زبان میں بات کرو۔ بھئی واہ — اب ہمیشہ یہاں ہی رہیں گے۔ خوشی و مسرت کو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان لمحات کے احساسات اتنے شدید تھے کہ آج بھی مجھے بعینہٖ یاد ہیں۔ اپنا وطن اور اپنی زبان کتنی بڑی نعمت ہے —!! یہ حقیقت بغیر کسی وضاحت کے ان چند لمحات میں محصور ہو کر میرے ذہن کے گوشے میں اس طرح محفوظ ہو گئی کہ آج بھی تصور میں ان کی یاد مثلِ برق کوند جاتی ہے۔ گو مشرقی پاکستان اپنا ہی وطنِ عزیز تھا۔ مگر وطن کے ساتھ بچپن کی یادوں، والدین، بھائی بہن اور عزیز رشتہ داروں کا جو تصور لازمی طور پر وابستہ ہے، درمیان میں ہزاروں میل کا خطۂ غیر اس تصورِ حسین کو یوں محو کرتا تھا کہ مشرقی پاکستان اپنا وطن ہوتے ہوئے بھی وطن کی بنیادی تعریف پر پورا نہ اترتا — اس حقیقت کو کیسے جھٹلاؤں کہ وہاں بیٹھ کر والدین اور عزیزوں کی یاد نے بہت بہت تڑپایا۔ اور ان تک نارسائی کے خیال نے اس سرسبز سرزمین کو دیارِ غیر ہی بنائے رکھا۔ اب سوچتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ وہ دوستیاں وہ خلوص، وہ بڑھ بڑھ کر بنگالی بولنا، بنگالی طور طریقے اپنانے کی کوشش، سب کچھ ہی فریب تھا، سراب تھا، وقت کی مصلحتوں کا ایسا چراغ تھا جو بادِ مخالف کا ایک جھونکا بھی برداشت نہ کر سکے۔

مغربی پاکستان میں آکر ملازمت کے سات سال سندھ کے مختلف ضلعوں میں گزار کر ہم لوگ ۱۹۶۷ء کے اگست میں اسلام آباد آ گئے۔ میرے شوہر کی پوسٹنگ مرکزی سکریٹریٹ میں وزارت تعلیم میں ہو گئی تھی۔

ہمیں جہاں مکان ملا یہ ایک آفیسرز کالونی تھی۔ سب افسروں کے مکانات ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ان سب مکانوں کے مکین ایک دوسرے کو اتنے قریب سے جانتے تھے کہ یہ تک معلوم ہو جاتا کہ ساتھ والے گھر میں آج کیا پکا ہے۔ ایک گھر کے کھانے کی خوشبو

سے دوسرا گھر بھی مہک جاتا۔ ایک گھر میں جھگڑا ہو تو دوسرے گھر میں تشویش پیدا ہو جاتی۔ کسی گھر کے مکین کب سوتے ہیں، کب جاگتے ہیں۔ کون مہمان آتے جاتے ہیں۔ اہلِ خانہ رات کو کب اور کس وقت پارٹی یا کلب سے لوٹتے ہیں۔ گھر میں تعلقات کیسے ہیں۔ بچوں کے کیا اشغال ہیں .... ان باتوں میں پڑوسی لامحالہ ایک دوسرے کے راز دار تھے۔

گھر کو ٹھیک کر کے جب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اپنے پڑوس میں کئی بنگالی افسروں کے گھر نظر آئے۔ ان میں ہمارے دوست بھی تھے۔ وہ بھی تھے جن سے ملاقات نہ تھی مگر غائبانہ تعارف ضرور تھا۔ اور وہ بھی تھے جو میرے شوہر کے زیرِ تربیت رہ چکے تھے۔ اور اب بہت اہم عہدوں پر متعین تھے۔ مرکزی ملازمتوں کے ماحول میں بنگالیوں کی بالادستی صاف طور پر واضح تھی۔ کوئی بنگالی افسر کوئی غیر اہم عہدہ لینے کو تیار نہ تھا۔ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں ہر سطح پر مساوی تقسیم کا مطالبہ، اور تقاضا ان سب کا مشترکہ فلسفہ اور لائحہ عمل تھا۔ بیشتر کلیدی عہدوں پر یہی لوگ متعین تھے۔ چونکہ سیاسی سطح پر اپنی نمائندگی سے یہ لوگ غیر مطمئن تھے۔ غالباً اسی ذہنی انتشار کو وہ ملازمتوں میں بڑا اور اہم حصہ لے کر پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان سب لوگوں میں بے مثال یگانگت تھی۔ چپڑاسی سے لے کر اعلیٰ ترین عہدے تک کے افراد ایک ہی رشتۂ اخوت میں پروئے ہوئے تھے۔ ان سب کی اسلام آباد میں بظاہر مشترکہ جدّوجہد یہی تھی کہ ملازمتوں میں اہم ترین عہدے انہیں ہی ملیں اور اس کے لئے یہ سب ایک دوسرے کے مکمل طور پر ممد و معاون تھے۔

ہمارے گھر کے دائیں طرف عبدالرّب چودھری رہتے تھے۔ یہ چھوٹے سے قد کے دُبلے پتلے بہت ذہین اور زیرک شخص تھے۔ انہیں ہم پہلے نہ جانتے تھے۔ مگر ہماری ان سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔ اس کے علاوہ بھی بنگال کی بہت سی پرانی دوستیوں

کی تجدید ہوئی اور پھر یوں ہوا کہ ان سب دوستوں نے ایسٹ پاکستان ایسوسی ایشن کا بغیر ممبر شپ کی فیس داخلہ چارج کئے، مجھے اور میرے شوہر کو ممبر بنالیا۔ یہ لوگ اپنی خاص قسم کی میٹنگوں میں تو ہمیں نہ بلاتے۔ مگر بڑی تقریبوں میں ہمیں مدعو کرتے۔

ان بنگالی دوستوں کی دوستی پر بھی تعصب و اجنبیت کی ہلکی سی پرچھائیں تھی۔ مگر مجموعی طور پر میں خود کو ان کے بہت قریب پاتی، مغربی پاکستان میں آکر ان کی بنیادی عادات و اطوار میں تبدیلی آچکی تھی۔ سرکاری ملازمتوں میں موافق ترین صورتِ حالات نے ان میں کسی حد تک احساسِ برتری ضرور پیدا کر دیا تھا۔ مگر ان میں اور ان کی بیگمات میں جذبۂ نمائش اتنا نہ بڑھا تھا کہ دیکھ کر طبیعت اوبھ جائے۔

ان کی خواتین میں تعلیم حاصل کرنے کی لگن بدستور تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری ایک طرحدار دوست نے مسز چشتی کے متعلق سُنا کہ وہ فیڈرل گورنمنٹ کالج فار گرلز میں تاریخ کی لیکچرار مقرر ہو گئی ہے تو فرطِ حیرت سے وہ بولائی جا رہی تھیں۔ بولیں "ارے وہ تو مڈل پاس بھی نہیں لگتی — تو کیا وہ واقعی ایم۔ اے پاس ہے — ؟؟" یہ طنز اس کی بہت سادہ وضع قطع، لباس اور رکھ رکھاؤ پر تھا۔ اور مجھے اپنی ایک الٹرا ماڈرن دوست شدت سے یاد آئیں جو اتفاق سے تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ مگر اپنی اس کمی کو نئے فیشن کے لباس، بالوں کے جدید ترین سٹائل، عجیب سطحی حرکتوں اور خاص طور پر تقریبوں میں ایک انداز سے سگریٹ کے کش لے کر ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہیں، اور فخریہ فرمایا کرتی ہیں: "مجھے دیکھو، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں ایم اے سے کم پڑھی ہوئی ہوں۔" اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔ ہم نے شرافت و عزت کی اقدار کو تو غتر بود کیا ہی تھا۔ علم کے پیمانے کو بھی نہ بخشا۔

اُسی سال دسمبر میں قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا۔ میرے شوہر کو سرکاری طور پر وہاں جانا پڑا۔ ان کا یکم دسمبر کا لکھا ہوا خط میرے سامنے ہے، لکھتے ہیں:-

کیمپ سیکنڈ کیپٹیل ۔ ڈھاکہ

۶۷ - ۱۲ - ۱

..... بالآخر ڈھاکہ آہی گیا ۔ یہاں ہر قسم کا بندوبست ہے ۔ عمدہ کمرہ، اچھا کھانا اور ہر قسم کی سہولت، غرضیکہ جسم کو اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ وافر مقدار میں، معقول حد تک ملی ہوئی ہیں ۔ لیکن پھر بھی دل نہیں لگتا ۔

وہی ڈھاکہ جس میں جوانی کے حسین ترین دن گزارے ہیں آج بیگانا سا لگ رہا ہے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ویسٹ پاکستان سے یہ اس قدر دُور ہے ۔ یہی فاصلہ تو میرے اور عزیزوں کے درمیان حائل ہے ۔ اور اسی لئے اس دوری کا شدّت سے احساس ہے ۔

مشرقی پاکستان میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک مقصدیت ہے ۔ اس اعتبار سے یہاں کی تبدیلی بڑی خوش آئند ہے ۔ ہر چیز بڑی تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہی ہے ۔ ڈھاکہ کی کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں ہے جو ایک بڑے تغیّر سے آشنا نہ ہو چکا ہو ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری جانی پہچانی سڑکیں یا گلیاں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں ۔ کسی کونے یا موڑ پر کوئی پرانی سی عمارت ایک بیمار زدہ بوڑھے کی طرح اس ماضی کی طرف نشان دہی کر دیتی ہے ۔ جس سے ہم آشنا تھے ۔ شاید ہمارے اور ہمارے جانے پہچانے ڈھاکہ میں یہی ایک بڑا رشتہ ہے ۔ ورنہ ہر چیز مختلف ہو چکی ہے ۔

وہ سیاسی طوفان جس کی لپیٹ میں ہمارے ملک کا یہ حصہ ۱۹۵۲ء میں آیا تھا ۔ آج اپنے شباب پر ہے ۔ اس کے لگائے ہوئے لسانی، معاشی، تمدّنی اور معاشرتی پودے خاصے بڑے ہو چکے ہیں ۔ ان کی شخصیت میں ایک نکھار اور توانائی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اس پورے منظر پر حاوی ہیں ۔

اُردو یہاں سے تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ کسی مکان، دکان یا موٹر پر اُردو لکھی نظر نہیں آتی۔ تمام شہر میں گھومنے کے بعد صرف دو جگہ دیکھا کہ بڑے سائن بورڈ پر چھوٹا سا اردو میں ترجمہ تھا۔ وہ تہذیبی خلا جسے ہم چھ سال پہلے محسوس کرتے تھے آج بہت وسیع ہو چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک پوری تہذیب ختم ہو کر ایک نئے معاشرہ کو جنم دے چکی ہے۔ یہ معاشرہ جیسا بھی ہو۔ اچھا یا بُرا۔ ہمارے معاشرے سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کی بنیادیں مغربی اور مشرقی پاکستان کے وسائل کی مساوی تقسیم پر استوار ہیں۔ اور یہ ایسے افراد کو تیزی سے جنم دے رہا ہے۔ جن کا اندازِ فکر اسی عصبیت کا مرہون منّت ہے۔

یہاں کا نوجوان طبقہ اسی ماحول میں پروان چڑھا ہے۔ اس کی نظر میں اس کی ہر کوتاہی کی ذمہ داری اس غیر مساوی برتاؤ پر ہے جو مغربی پاکستان نے اس حصّہ کے ساتھ روا رکھا۔ ان کا یہ خیال کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن یہ بات اب صرف خیال تک محدود نہیں ہے۔ یہ اب یہاں کا فلسفۂ حیات بن چکا ہے اور نوجوان نسل ہر اس چیز سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جو دونوں صوبوں میں مشترک ہے۔ سب سے زیادہ فکر کی بات یہ ہے کہ نئی نسل پر سے مذہب کا اثر بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب پستی اور بڑھاپے کی علامت بن چکا ہے اور اس کے ساتھ اس عظیم پُل کے ستون بھی ہلتے جا رہے ہیں جو ملک کے دونوں حصّوں کو مضبوطی کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔

اس اُمڈتے ہُوئے طوفان نے کیا کچھ تباہ کر ڈالا۔ اس کا اندازہ جب ہی ہو سکے گا۔ جب اس کی شدّت ختم ہو۔ لیکن اس وقت اس کا سب سے زیادہ دباؤ ان لوگوں پر پڑ رہا ہے جو دونوں صوبوں کی تہذیب کے مشترک نشان تھے۔ میری مُراد وہ لوگ ہیں جو کلکتہ اور مرشد آباد کے تہذیبی اثرات پھیلا رہے ہیں۔ جن کی زبان بذات خود اُردو ہے یا جو بڑے بڑے مذہبی ادارے اُردو میں چلا رہے تھے۔"

تعجب کی بات یہ تھی کہ ان دنوں بنگال کو مرکزی حکومت کی طرف سے جو مالی وسائل حاصل تھے۔ جس طرح انہیں پاکستان کے خزانے تک دسترس تھی ویسی پہلے تو کبھی نہ تھی۔ نہ خواجہ ناظم الدین صاحب کے زمانے میں اور نہ سہروردی صاحب (جنہیں وہ دیو زاد سیاستدان کہتے تھے) کے زمانے میں —— اس طرح تو ان پر ملک کے تمام وسائل کبھی نچھاور نہ کئے گئے تھے۔ پھر ان کی غیر اطمینانی اور انتشار کا باعث — ؟؟

یہ سوال ہر ہوش مند شخص کے ذہن میں آتا تھا۔ فکرِ ہر کس بقدر ہمّتِ اوست۔ ہر فرد نے اس کا جواب اپنے طور پر سوچا ہوگا۔ میرے ذہن میں تو اس کا جواب کچھ یوں آیا کہ ——

"بنگال سیاسی طور پر ہمیشہ بیدار رہا ہے۔ انگریزوں کے اس زمانے میں جب برطانوی حکومت کا سورج غروب نہ ہوتا تھا، منظم بغاوت وہیں سے سر اٹھاتی تھی۔ ارابندو کی بغاوت، چٹاگانگ کے خزانے کا لوٹنا اور ارمانی ٹولہ کیس وغیرہ۔ یہ یہاں ہی کے اثرات تھے کہ سوبھاش چندر بوس دوسری جنگِ عظیم میں خاموشی سے جاپان چلے گئے اور وہاں جا کر انڈین نیشنل آرمی بنائی۔ مسلمانوں کی بھی یہاں لاتعداد تحریکوں نے سر ابھارا۔ فرائضی موومنٹ، ٹیٹو میر کی انگریزوں کے خلاف مدافعت۔ میمن سنگھ کے مسلمان کاشت کاروں کی تحریک وغیرہ جن کی بنا پر بنگال تقسیم کیا گیا۔ اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ تحریکِ پاکستان کی بھی مکمل طور پر مخلصانہ حمایت اسی علاقے سے ہوئی تھی۔ مگر اب اس علاقے کو دولت و عہدوں کی خیرہ کن چمک میں محصور کرنے کی کوشش ہو رہی تھی تاکہ سیاسی شعور مالی وسائل اور جدید سہولیات کی دیوی کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ بالآخر ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

مشرقی پاکستان میں تعلیم مجموعی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ابتداء

ہی سے ملک کی یک جہتی کی بنیادیں شاطرانہ انداز میں کھرچ رہے تھے۔ کئی تعلیمی اداروں میں بجائے قائداعظم کے گاندھی اور نہرو کی تصاویر آویزاں ہوا کرتی تھیں بچوں کے نصاب کی کتابوں میں ایسے موضوع و تحریریں بھی شامل تھیں جو نظریۂ پاکستان کے سراسر خلاف تھیں۔ سکولوں کے اساتذہ بیشتر ہندو تھے۔ بڑے شہروں کے کالجوں میں تو مسلمان اساتذہ کافی تعداد میں تھے۔ مگر ذیلی علاقوں میں درس و تدریس کا سارا سلسلہ ہندو حضرات چلا رہے تھے۔ بازی اس ہوشیاری سے کھیلی جا رہی تھی کہ نوجوان طبقہ غیر محسوس طور پر مغربی پاکستانی بھائیوں سے متنفر ہوتا جا رہا تھا۔ رشتۂ اخوت تار تار ہونے کو تھا اور تقدیر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کو نوچنے والے ہاتھ وہی بن چکے تھے جنہوں نے اس وحدت و یک جہتی کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔

پاکستان کے یہ دونوں بازو اپنے درمیان اتنے وسیع خطۂ غیر کی موجودگی کے باوجود اب تک ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اس میں سقم پیدا ہو رہا تھا۔ سوائے فوجی سطح کے، دونوں حصوں میں کوئی رابطہ باقی نہ تھا۔ انتظامیہ کا سلسلہ بالکل الگ الگ ہو چکا تھا۔ اسلام آباد میں پالیسیاں مرتب ہوتیں جو مشرقی پاکستان کے لئے منفعت بخش ہونے کے باوجود ان کے لئے ناقابل قبول تھیں۔ ہمارے ایک بنگالی دوست ایک روز کہہ رہے تھے "جب تک قومی پالیسیاں اسلام آباد کے ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بنیں گی وہ ہمارے لئے قابلِ عمل ہو ہی نہیں سکتیں۔"

اسلام آباد کا قیام ان کے لئے نہ جانے کس طرح بے حد تلخ حقیقت بن چکی تھی۔ حالانکہ یہ بات بالکل بے بنیاد تھی۔ مگر عبدالرب چودھری اکثر کہتے: "ہمارے پٹ سن کی آمدنی سے اسلام آباد کے محلات تعمیر ہوئے ہیں"۔ اسی تلخی کو مٹانے کے لئے ڈھاکہ میں سیکنڈ کیپٹل کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔ اس تعمیر پر کروڑوں

روپوں کا خرچ بھی بنگالیوں کی اسلام آباد کی تلخی نہ کم کر سکا۔

سیاسی سطح پر بنگالی اپنی نمائندگی سے بہت خفا تھے۔ دراصل ۱۹۵۸ء میں پُرسکون فوجی انقلاب کے بعد جو حکومت وجود میں آئی تھی اس کا رنگ کم و بیش عسکرانہ تھا۔ مغربی پاکستان تو چونکہ بنیادی طور پر عسکری علاقہ ہے اس لیے یہاں بغیر کسی حیل و حجت کے صورتِ حالات قبول کر لی گئی۔ مگر بنگال میں ایسا نہ ہو سکا۔ بنیادی جمہوریت کا دستور وضع کیا گیا۔ اس میں بنگال کے نمائندے اس طرح شاملِ حکومت ہوئے کہ ان کی ذاتی رائے یا تو تھی نہیں یا عسکری رعب و دبدبہ نے ان میں صریحاً اظہار کا حوصلہ ہی نہ رہنے دیا۔ جو کچھ بھی تھا صحیح یا غلط۔ مگر بنگالی اس سیاسی نمائندگی کو کٹھ پتلیوں کا تماشا کہا کرتے تھے۔ اور بنگالی کا سیاسی طور پر بیدار شعور اس سے بے حد غیر مطمئن تھا۔

ہمارے بنگالی وزراء کا انتخاب بھی خوب دلچسپ ہوتا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک صاحب جی۔ ڈبلیو۔ چودھری رہا کرتے تھے۔ ہم جیسے ہی عام سے افسر۔ یک دم سننے میں آیا کہ وہ بہت قابل انسان ہیں اور صدر یحییٰ صاحب کو بہت پسند آئے ہیں۔ جانے ان کی قابلیت ابھی تک مخفی کیسے رہی —

اسلام آباد یونیورسٹی میں لار کی ایم۔ فل کی کلاسیں شروع کرنے والے تھے اور ان کی پیش کش پر مجھے ان سے کچھ کتابیں لینی تھیں۔ شام کو گھر جانے کی غرض سے اس طرف گئی۔ دیکھا کہ ان کے گھر کے سامنے لاتعداد موٹریں کھڑی ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاید کوئی دعوت کی تقریب ہوگی اس لئے جانا مناسب نہیں، گھر واپس آ گئی۔

اور پھر دوسری صبح جو اخبار اٹھایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

پرانے زمانے کی کہانیوں میں سنتے آئے تھے کہ فلاں شہر کا بادشاہ مر گیا۔ طے پایا کہ دوسری صبح جس شخص کے سر پر کوّا بیٹھے گا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ کتنے معصوم

لوگ ہوا کرتے تھے جو ایسے اہم فیصلے پرندوں اور جانوروں کو سونپ دیتے تھے۔!!

چودھری صاحب وزیر بن گئے ــ اور پھر ایسے باتدبیر مانتے چلے گئے کہ ان کے اپنے بقول، ان سے زیادہ صدر یحییٰ کے قریب کوئی نہ تھا۔

وہ بڑے وزیروں والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ میں، مسز عبدالرب چودھری کے ساتھ ان کی بیگم کو مبارک باد دینے گئی۔ وہ دوسری منزل کے ٹیرس کے جنگلے کے ساتھ لگے ہوئے جھک کر نیچے دیکھ رہے تھے۔ بغیر کسی تصنع و بناوٹ کے ہمیں دیکھتے ہی پہلے کی طرح پُرجوش علیک سلیک اور مزاج پرسی ہوئی اور اس سمے مجھے وہ بے تکلف سا شخص، جو مرکزی وزیر بن چکا تھا بہت اچھا لگا۔

مسز جی۔ ڈبلیو۔ چودھری پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہی تھیں اور امتحان دینے کی غرض سے کافی عرصہ کے لئے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ میں نے جب مرکزی وزیر کی بیگم ہونے کی حیثیت سے ان کی نئی ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو کہنے لگیں۔ "چودھری صاحب کہتے ہیں کہ اگر یہ وزارت تمہاری تعلیم کے راستہ میں حائل ہو تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔ مگر تمہاری تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہونے دوں گا۔" بنگالیوں کے حصولِ تعلیم کے اس شدید جذبے کی میں ہمیشہ گرویدہ رہی ہوں۔

سنہ ۱۹۷۰ء آیا۔ الیکشن کا سلسلہ زور و شور کے ساتھ شروع ہو گیا۔ ایک زمانے میں جب پاکستانی جذبات اپنی معراج پر تھے۔ مشہور تھا کہ قائداعظم اگر بجلی کے کھمبے کو بھی مسلم لیگ کا ٹکٹ دیں تو اسی کو مسلمان کا ووٹ ملے گا ــ پانسہ یوں پلٹا کہ بنگال میں مسلم لیگ کے خلاف نعرہ لگا کر عوامی لیگ کے ٹکٹ پر جو شخص بھی کھڑا ہوا، ووٹ اسی کو ملنے کا احتمال تھا۔

ان ہی دنوں میں مشرقی بنگال میں سیلاب آگیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس

سیلاب کی درحقیقت کیا نوعیت تھی۔ کیوں کہ نومبر کے ابتدائی ایام میں ہمارے چند دوست کوئٹہ سے بنگال گئے۔ وہ ڈھاکہ، کومیلا، چاٹگانگ، رنگامتی، اور دیگر کئی اضلاع میں بھی گئے۔ وہاں زندگی معمول کے مطابق تھی۔ نشیبی اضلاع میں تو پانی کا آنا قدرتی امر ہے۔ اور یہ ہر سال کا معمول وہاں کے ذیلی علاقوں کی معیشت کا لازمی عنصر ہے۔ اگر ان علاقوں میں پانی نہ بھرے تو جیسے میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہ لوگ بھوکے مر جائیں، ان کا سنہری سونا (پٹ سن) بالکل ختم ہو جائے۔ بے شمار مانجھی بے روزگار ہو جائیں اور دور افتادہ گاؤں میں بیاہی ہوئی بیٹیوں کی آنکھیں بیرن اور بابل کا انتظار کرتے کرتے پتھرا جائیں۔ یہ پانی تو ان کی زندگی ہے۔ اسے وہ لوگ تو آفت نہیں سمجھتے۔ مگر ان الیکشن کے ہنگاموں میں وہ پانی ایسی آفت ناگہانی بنا کہ پورے ملک کی وحدت اس کی زد میں آ گئی۔

صدر یحییٰ چین کے دورے سے واپس آئے تو مشرقی پاکستان کا سیلاب زدہ علاقہ دیکھنے چلے گئے۔ جی۔ ڈبلیو۔ چودہری نے ہیلی کاپٹر پر صدر صاحب کے ساتھ سیلاب زدہ علاقے کا دورہ کیا۔ صدر صاحب کی مجیب الرحمٰن سے بھی ملاقات ہوئی اور بنگال کو آفت زدہ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ٹیلی ویژن پر وہ علاقے دکھائے گئے جہاں پانی بھرا ہوا تھا۔ مغربی پاکستانی اپنے بھائیوں کے دُکھ اور مصیبت پر تڑپ گئے۔

مرکزی حکومت کی طرف سے امداد کے طور پر بھاری رقوم اور دیگر اشیاء تو بھیجی ہی گئی تھیں۔ مغربی پاکستان کے شہر شہر، قریہ قریہ اور گلی گلی سیلاب زدگان کے لئے فنڈ اور دوسری چیزیں جمع کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔ ہر انجمن اور ہر ایسوسی ایشن نے اپنی مقدور بھر مشرقی پاکستان کے لئے امداد بھیجی۔

ادھر لوگوں کا اخلاص تجاوز کر کے احمقانہ حدود کو چھو رہا تھا — اور ادھر

مجیب الرحمٰن صاحب نشیبی اضلاع کے ہر گاؤں میں گاڑھے کی دھوتی کرتا پہنے ہوئے خود گئے۔ ہر ہر جگہ جلسے منعقد کئے۔ دھواں دار تقاریر کیں۔ اپنے لوگوں کی حالت زار کی بہت لچھے دار اور مؤثر الفاظ میں وضاحت کی اور پھر مرکزی حکومت کی بے حسی اور مغربی پاکستان والوں کی لاتعلقی کا ذکر کرتے ہوئے شدتِ گریہ سے اپنا بڑا سارومال جیب سے نکال کر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں بے بسی کا اظہار کیا کہ "جب تک مغربی پاکستان کی بالادستی ہم پر قائم ہے۔ ہمارے غریب لوگوں کی حالت نہیں سدھر سکتی۔"

اسلام آباد سے حکام ڈھاکہ تو جاتے۔ مگر ذیلی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں کوئی ایسا تعلق قائم نہ رہا تھا جو ان علاقوں میں مجیب الرحمٰن کے طلسم کا ادہام کرتا۔ جو ان کی مؤثر اداکاری کا ازالہ کر سکتا۔ جو لوگوں کو اصل حالات سے آگاہ کرتا۔ جو انہیں بتاتا کہ مغربی پاکستانی تو مجنونہ طور پر تم سے محبت کرتے ہیں۔ وہ تو تمہاری اس مصیبت پر بھی بے چین ہیں۔ مغربی پاکستان کے ہر کوچے کا دل تمہارے ساتھ دھڑکنے کا خواہاں ہے۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ رابطے کو ہم اپنے ہاتھوں نہ جانے کن مصلحتوں کی بناء پر عرصہ ہوا خود ہی ختم کر چکے تھے۔

مجیب الرحمٰن کا جادو بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کرتا چلا گیا۔ ان کے سحر کے ہالہ میں مشرقی پاکستان اس طرح مسحور ہو کر رہ گیا کہ وہاں کے ہر گوشہ سے "بونگو بوندھو" نجات دہندہ بن کر ابھر آئے۔

○

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

اس کے بعد سیاسی حالات کسی وضاحت کے طلب گار نہیں — نہ جانے اغیار نے کیا کیا جال بچھائے۔ نہ جانے اپنوں میں کس کی کس حد تک کیا غلطی تھی۔ یہ تو کوئی سیاسی شخصیت ہی بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۷۱ء کی پہلی تاریخوں میں جمعہ کا روز تھا۔ بیت المکرم کے احاطہ میں جمعہ کی نماز کے بعد مجیب الرحمٰن صاحب نے ایک تقریر کی — دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ اس اجتماع میں اتنے زیادہ لوگ تھے کہ سر ہی سر نظر آتے تھے اور جذبات کا وہی عالم تھا جو قائداعظم کے پاکستان بننے کے بعد پہلی مرتبہ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے تھا۔ "بونگو بوندو" کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لوگ سینے پر لکھ لینے کے لئے کوشاں تھے کہ "بونگو بوندو" نے اپنے منشور کا اعلان کیا۔ جس میں واضح طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذکر تھا۔

— اور پھر— جگہ جگہ پاکستان کے جھنڈے اور قائداعظمؒ کی تصویر کی بے حرمتی کی گئی— اللہ اللہ— وہی لوگ جو اس ملک کی تعمیر میں بیک آواز و بیک تن و جان پیش پیش تھے۔ اس کی تخریب میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ مستقبل کا مورخ اس جذباتی انقلاب کو نہ جانے کیا نام دے گا۔

مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوگئی۔ مشرقی پاکستانی فوج کی تربیت ایسے خطوط پر کی گئی تھی کہ اس کا ضبط و انضباط مثالی کہا جاتا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ بغاوت کرنے والے ہماری اسی ضابطوں کی آئینہ دار فوج کے اراکین تھے۔ وہ بظاہر کوئی غیر نہ تھے۔ بلکہ اپنی ہی عسکری قوت کے بہادر باوردی اشخاص تھے۔ جنہوں نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی قسمیں کھائی ہوئی تھیں— کسی کو کیا الزام دیں، کہ زخم اپنوں ہی نے لگائے تھے۔ بغاوت ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ سے ہی شروع ہوئی تھی۔ پھر جو قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو زمانۂ قدیم کے وحشیانہ مظالم کے قصے بھی ماند پڑ گئے۔

صدر صاحب ایک مختصر ترین دورے پر ڈھاکہ گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن سے گفت و شنید ہوئی۔ مگر بات بنائے نہ بنی— اور— ۲۵ مارچ کو فوجی ایکشن لے لیا گیا۔ اس اثناء میں بھارت کے ہوائی جہاز "گنگا" کے اغوا کا ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا۔ اور ہم اپنی روایتی نادانی سے ان دونوں اغوا کنندہ لڑکوں کو قوم کے عظیم سپوت کہہ کر اپنی عادت کے مطابق ہاروں اور پھولوں سے لاد چکے تھے۔ اس ڈرامے کے نتیجے کے طور پر بھارت اپنی سرزمین کے اوپر سے ہمارے جہازوں کی پرواز کی اجازت منسوخ کر چکا تھا اور ہمارے جہازوں کو سری لنکا کے راستے پرواز کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ فوجی ایکشن پر اخراجات کا کیا عالم ہوگا— ہم نے سنا کہ ہر روز ادھر اُدھر تک محض نقل و حرکت پر تخمیناً کم و بیش ایک کروڑ روپے صرف

ہو رہے تھے۔

اُدھر آگ و خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور اِدھر ہم لوگ گھروں میں بیٹھے تبصرہ کر رہے تھے کہ یہ ایکشن صحیح ہے یا غلط ـــــ جس کے منہ میں جو آتا وہ کہتا۔ مگر جب ہمارے ایک بہت سنجیدہ و متین، دانش مند و زیرک دوست نے جو خود چھپکلی کو بھی کبھی نہ مارتے تھے۔ اس ایکشن کو برملا صحیح کہا اور بنگالیوں کو "درست" کرنے کا یہ واحد طریقہ گردانا تو میں انگشت بدنداں رہ گئی ـــــ کیا ہم سب کی سوچوں کے زاویے اس طرح انتقامی بن چکے تھے ـــــ !! ہم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ مار دھاڑ سے دشمن ممالک تو فتح ہو سکتے ہیں۔ مگر اپنے قومی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے ـــــ اور ہم نے تو یہ تک نہ سوچا کہ ہمارا غریب ملک وسائل کے اس بے دریغ ضیاع کا کب تک متحمل ہوگا ـــــ ؟؟ ہم نے کچھ بھی نہ سوچا . . . سوچ بچار سے ہم نے اپنے لطیف خیالات کو بوجھل بنانے کی اجازت ہی نہیں دی۔

وہاں کے حالات کا معاشی اور مدنی جائزہ لینے کے لئے مرکزی حکومت نے ایک ٹیم مظفر حسین صاحب کی نگرانی میں ڈھاکہ بھیجی۔ وہاں کے اس قدر دہشتناک حالات سننے میں آ رہے تھے کہ جو افراد اس ٹیم میں شامل تھے ان کے گھروں میں دوست ہمدردی کی غرض سے گئے۔ اس ٹیم نے جائے وقوع پر حالات کا کیا جائزہ لیا اور کیا رپورٹ بھیجی ـــــ ؟؟ اس کا تو علم نہیں۔ مگر کچھ دنوں بعد ہی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے انتظامیہ کے کچھ افراد وہاں بھیجے جائیں ـــــ ان حالات میں اس فیصلے کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ :-

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اب جب پورا علاقہ نفرت و عصبیت کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور بندوق کی آتش

گولیوں کا کھیل کھیلا جا رہا تھا تو سول انتظامیہ وہاں جاکر کیا انتظام کرے گی۔

یہ بھی واضح تھا کہ دریں حالات وہی لوگ وہاں بھیجے جائیں گے۔ جنہیں وہاں کے انتظام کا تجربہ ہے۔ وہ حضرات جو مشرقی پاکستان میں اپنی مدّت ملازمت مکمل کر کے آئے تھے۔ ان کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔ ہر ایک کو اپنی جان کی فکر لاحق ہوئی۔ ہر ایک اپنی جگہ تذبذب دکش مکش میں گرفتار۔

اسی روز اتفاق سے پنڈی کے کمشنر رفیق عنایت مرزا، ڈپٹی کمشنر محمد صادق کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائے اور یقین دلایا کہ جانے والوں کی فہرست میں میرے شوہر کا نام شامل نہیں۔ اسی روز ہم لوگ اپنے لان میں بیٹھے تھے۔ پڑوس سے مسٹر و بیگم کوریجو بھی وہیں موجود تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں کہ شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں ایک موٹر سائیکل پھٹ پھٹ کرتی ہوئی ہمارے گھر میں داخل ہوئی۔ چھٹی حِس نے فوراً آگاہ کیا کہ خیریت نہیں ہے۔ میں بھاگی ہوئی گئی اس سے خط لیا۔ برآمدے کی مدھم روشنی میں سرکاری خط کی عبارت کو پڑھ کر ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی معلوم دی۔ اور میں وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہم جو اپنی مقررہ مدتِ ملازمت سے زیادہ عرصہ وہاں گزار چکے تھے اس وقت بھی قربانی کا قرعہ ہمارے نام ہی نکلا۔ وہاں کی آتش کی تپش تو چہرہ پر سیدھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس کے علاوہ مسائل کا گورکھ دھندا اس طرح اُلجھا ہوا تھا کہ اس کی ڈور کا کنارہ ڈھونڈے سے بھی ہاتھ نہ لگ رہا تھا۔ بچے مختلف سکولوں میں پڑھ رہے تھے ان کا کیا ہوگا۔؟ تنہا عورت کا رہنا ہمارے معاشرے میں بذاتِ خود ہر مصیبت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پھر موت و زلیست کا کیا بھروسہ۔

ے آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یہ ضروری تو نہیں کہ ہر آتشِ نمرود اولادِ ابراہیم کے لئے گلزار بن جائے۔ بہت

بڑے امتحان میں خالقِ اکبر نے ڈال دیا ۔۔ مرکزی سیکرٹریٹ میں بنگالی حضرات نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ "جو لوگ وہاں جا رہے ہیں ۔ وہ واپس نہیں آئیں گے ۔"

روانگی سے قبل میرے شوہر نے بیٹھ کر مجھے بچوں کے متعلق ہدایات دیں ۔ باقی تمام حالات کی اونچ نیچ بتائی ۔ بالکل وصیت کے انداز میں ہر بات سمجھائی ، تو مجھ میں ضبط کا یارا نہ رہا ۔

چند روز تو زمین اور آسمان گھومتے ہوئے معلوم دیتے تھے ۔ میں ہر وقت آیت کریمہ کا ورد کرتی ۔ کبھی سورۂ یوسف کی یہ آیت فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا ص وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ٥ پڑھتی ۔ وقت کی گردش تھم کر رہ گئی تھی ۔ ہر چیز جامد ہو چکی تھی ۔ میرے اندر بھی اور گرد و پیش میں بھی ۔

میرے شوہر کو گئے چار روز ہو چکے تھے کہ ۱۲ مئی کو سید محمد صاحب نے ان کے ڈھاکہ کے کمشنر متعین ہونے کی اطلاع دی ۔ ان کے خطوط ملنے لگے ۔ جن میں ہر مضمون کی ابتداد اور انتہا اسی مصرعہ طرح پر ہوتی کہ وہاں کے حالات کافی حد تک معمول پر آچکے ہیں ۔۔ "مگر پھر بھی زندگی ابھی ایک عام زندگی نہیں ۔ اس میں گزرے ہوئے طوفان کی سی کیفیت ہے یعنی انتشار اور بے یقینی ۔۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ ہم حالات کا رُخ عمومیت کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گئے ۔۔ قافلہ منزل کی طرف چل پڑا ہے اور انتہا تک پہنچنا وقت کے ساتھ مفاہمت والی بات ہے ۔"

یہاں بیٹھے ہوئے ہر روز وحشتناک افواہیں سن رہی تھی ۔ مگر میرے شوہر حالات معمول پر آنے کا مژدہ سنا رہے تھے ۔۔ اور میری جان اس "ہست و بود" کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی ۔ ہر روز عجیب و غریب افواہیں پھیلتی رہتیں ۔۔ ہر افواہ جان ہی نکال دیتی ۔ ڈھاکہ میں کمشنر کا گھر تو موجود تھا ہی ، میں نے قطرہ

قطرہ قطرہ گھلنے کی بجائے

بے دھڑک کود گیا آتشِ نمرود میں عشق

کے مصداق اس آگ میں بیک جست کود جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ سب عزیزوں اور دوستوں نے اسے کوتاہ نظری پر مبنی، غیر دانش مندانہ قدم گردانا۔ مگر میں ہر مصلحت سے بے نیاز اپنے ارادے پر قائم رہی۔ سامان کچھ اِدھر اُدھر رکھوایا، کچھ کسی کو دیا۔ بیٹی کو ایبٹ آباد پبلک سکول کے بورڈنگ میں داخل کروا دیا کہ بیٹی کو ان غیر یقینی حالات میں لے جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر ڈھاکہ جانے کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔

ہمارے بنگالی دوستوں میں سے حبیب الرحمٰن جو مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس بن چکے تھے کا تبادلہ اسلام آباد میں مرکزی وزارت قانون میں ہو گیا تھا۔ وہ ملنے آئے۔ تنہا ہی تھے۔ اپنے تبادلے سے بہت بد دل اور مایوس سے لگ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ۱۹۵۰ء میں ہم ڈھاکہ میں تھے تو ان کا تبادلہ مغربی پاکستان ہوا تھا تو انہوں نے چڑ کر کہا تھا کہ "مغربی پاکستان میں میری لاش ہی جا سکتی ہے میں کبھی نہ جاؤں گا۔" یہاں تک کہ انہوں نے انتظامیہ چھوڑ کر عدلیہ کی لائن اپنالی۔ تاکہ دوسرے بازو میں نہ جانا پڑے۔ مگر قسمت میں دانا پانی یہاں کا تھا۔ لہٰذا آئے تو مگر احساس شکست کے ساتھ ــــ حبیب کے ساتھ میرا یہ سودا ہوا کہ وہ میری موٹر، یہاں لے لیں گے اور ان کی بیگم شمیم ڈھاکہ میں اپنی موٹر بیچ کر مجھے رقم دے دیں گی یا مجھے موٹر ہی دے دیں گی۔ لیجئے موٹر کا مسئلہ اس طرح حل ہو گیا۔

شمیم جو میمن سنگھ میں ایک نو عمر ایف اے پاس شرمیلی سی لڑکی تھی اب نہ صرف چار بچوں کی ماں بلکہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس، پُر اعتماد خاتون تھی۔ اس کا کوٹھی۔ کان زیرِ تعمیر تھا۔ جس کی نگرانی کے لئے وہ ابھی تک ڈھاکہ میں تھی۔

یکم جولائی کو میں کراچی سے جہاز میں بیٹھی۔ وہ گھر جس کا ایک ایک تنکا میں نے اپنی آرزوؤں سے چن کر بنایا تھا۔ منتشر ہو چکا تھا۔ میرے احساسات عجیب گڈمڈ سے تھے۔ مختلف قسم کے امکانات باری باری ذہن کی سکرین پر آتے اور میں آنکھیں بند کر کے ان کا تجزیہ کرتی ہوئی چونک جاتی۔ تمام راستے "کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے۔" کا عالم رہا۔

○

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ڈھاکہ ائرپورٹ پر جہاز اترا۔ انجانے اندیشوں سے دل یک بیک اس زور سے دھڑکا کہ تمام حواس پر حاوی ہو گیا۔ جہاز کی کھڑکی ہی سے باہر نظر ڈالی تو جہاز کے بالکل قریب میرے شوہر کھڑے تھے۔ اپنے ساتھ کھڑے ہوئے ایک صاحب سے باتیں کرتے ہوئے جہاز پر نظریں جما کر ہنستے ہوئے —— ارے! یہ تو سب کچھ نارمل لگ رہا ہے —— !! —— اور میرے سب اندیشے یوں غائب ہو گئے جیسے سورج کی تیز کرنوں نے ساری دھند کا صفایا کر دیا ہو۔

میں ہوائی جہاز سے نیچے اتری۔ ہمارے ہمراہ ایک اور خاتون بھی اپنے تین بچوں کے ہمراہ سفر کر رہی تھیں۔ میں نے بارہا دزدیدہ نگاہوں سے ان کا جائزہ لے کر ان کے متعلق قیاس آرائی کی تھی اور ان کے دیکھنے پر اجنبیت سے دوسری طرف نظریں

پھیلی تھیں۔ بے حد پیاری خاتون کے چہرے پر معصوم سی بے نیازی کی تحریر عیاں تھی۔ میرے شوہر کے ساتھ کھڑے صاحب ان خاتون کی طرف بڑھے اور جب تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ ہماری تو منزل ایک ہی ہے۔

ہم لوگوں کے علاوہ باقی تمام مسافر مسلح افواج سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی پرانے دوست ملے۔ سب کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی یوں محسوس ہوتا، جیسے سارا ماحول ہی غیر معمولی ہو۔

گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ خالی خالی سڑکیں نظر و فکر کو چونکا رہی تھیں۔ مون سون کی بدلیاں گھری ہوئی تھیں۔ گرد و پیش سے گیلی مٹی، پانی اور سبزے کی مخصوص باس اُٹھ رہی تھی۔ مگر یہ بادلوں کی نغموں بھری سرزمین کس قدر اداس لگ رہی تھی۔ چاروں طرف گہرا سکوت اس طرح طاری تھا جیسے کوئی تنہا مسافر سب کچھ لٹا کر خالی خالی نظریں لئے پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ سائیکل رکشا جو اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے، وہ چاکلیٹی رنگ کے بے شمار لوگ محض دھوتی اور گنجی پہنے، چھتری ہاتھ میں لئے ہوئے، سڑکوں پر سرگرم روزگار، رنگ برنگے کنارے کی سوتی ساڑھیاں زیب تن کئے پلو کو اپنے گرد لپیٹے ہُوئے خواتین، وہ سب کیا ہوئے ...!! وہ جو اس رومانوی فضا کا سادہ پُرکار جزو لازم تھے وہ سب کہاں کھو گئے۔ ان سب کے بغیر یہ فضا اپنے تمام ترحُسن کے باوجود بیوہ کی مانگ کی طرح کیسی اُجڑی اُجڑی لگ رہی تھی — یہ ڈھاکہ تھا — مگر یہ وہ ڈھاکہ تو نہ تھا جس کی رونق سے میں مانوس تھی۔

موٹر گھر میں داخل ہوئی۔ آبادی کا احساس ہوا۔ دروازے پر سے سپاہی نے کھٹ سے بندوق پر سلامی کا ہاتھ مارا۔ میں چونک گئی۔ چلو کچھ لوگ تو چلتے پھرتے نظر آئے نا — بلا سے وردی میں ہی سہی۔ مگر انسان تو ہیں گوشت پوست کے۔

گھر کے اندر ہر چیز بالکل نارمل تھی۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر چودھری صاحب اور ثریا بھابی سے باتیں کیں۔ تو شہر کی سنسانی بہت دور کی چیز معلوم ہوئی ۔ ہائے اللہ! کتنے پیارے سے لوگ ہیں یہ ۔ اور اب ان کا ساتھ دن رات رہے گا۔ بھئی واہ ساری پریشانیاں، تمام کوفت اور سب اداسی ڈھل گئی۔

ڈھاکہ کی غیر یقینی اور پرخطر صورتِ حال نے، مغربی پاکستان سے گئے ہوئے افراد میں کمال درجہ کی یک جہتی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ سب کی کوشش یہی تھی کہ مل کر رہیں۔ کمشنر ہاؤس میں میرے شوہر اور چودھری صاحب جو مشرقی پاکستان کے آئی جی پولیس تھے مل کر رہ رہے تھے۔ آئی جی کا سرکاری مکان پولیس ہاؤس بنا دیا گیا تھا ۔ وہاں پولیس کے افسران مقیم تھے۔ انتظامیہ کے باقی تمام افراد جو مغربی پاکستان سے فوجی ایکشن کے بعد آئے تھے۔ سرکٹ ہاؤس میں مل کر رہ رہے تھے۔ چونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔ ایسی کشتی جو طوفانی حالات کی خوں ریز لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس لئے عدم تحفظ کے احساس نے سب کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ سب ایک ہی خاندان کے افراد بن گئے تھے۔

ان دنوں بنگالیوں کی بربریت کے قصے عام تھے۔ ای۔ پی۔ آر کے افسروں اور جوانوں کو کس بری طرح قتل کیا گیا تھا۔ عورتوں کی کس ظلم سے آبروریزی کی گئی تھی۔ یہ سب سفاکانہ عمل زیادہ تر ای پی آر اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مسلح بھیڑیوں نے کئے تھے۔ چائے کے باغات میں کچھ شہری آبادی سے بھی یہ ستم گری منسوب کی جا رہی تھی۔

چوآڈانگا جہاں ہم نے ملازمت کے ابتدائی ایام مسرت اور سکون سے گزرے تھے۔ وہاں کے ایس ڈی او، اور اس کی حاملہ بیوی کو انتہائی بیدردی سے ہلاک کیا گیا تھا ۔ سُنا تھا کہ جب ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باوردی اشخاص ایس ڈی او، کو مارنے گئے تو شہری آبادی اس کی مدد کو آئی اور کہا کہ "ہمارے ایس ڈی او صاحب

بہت اچھے ہیں، انہیں ہم مارنے نہ دیں گے"۔ مدافعت دیکھ کر ان بھیڑیوں کی ریاکاری نے ایک اور رُخ بدلا اور انہوں نے شہری آبادی کو یقین دلایا کہ وہ ایس ڈی او کو بحفاظت یہاں سے لے جا کر محفوظ جگہ پہنچا دیں گے۔ مگر صرف دس میل پرے جا کر ایس، ڈی او اور اس کی حاملہ نوجوان بیوی کو اس بیدردی سے ہلاک کیا کہ فلکِ کج رفتا کی آنکھ بھی پُرنم ہو گئی ہوگی۔

بعض ایسے مقتل کے متعلق بھی سُنا جہاں لوگوں کو بند کر کے ان کا تمام خون ڈاکٹری سرنجوں سے نکال لیا اور اس طرح انہیں موت کے اندھیرے غاروں میں دھکیلا گیا۔ بعض مقتل تو واقعی مذبحہ خانے بنے جہاں بے گناہ جوان، بچے اور بوڑھے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔

دراصل جب ۲۵ مارچ کو ملٹری ایکشن کا اعلان ہوا اور مغربی پاکستان سے فوج آنی شروع ہو گئی، تو ای پی آر، اور ای بی آر کے باغی یک دم بدحواس ہو گئے — پاکستانی فوج سے ٹکر لینے کا ان بزدلوں میں بوتہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ ڈھاکہ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور بدمست ہاتھیوں کی طرح جدھر سے گزرے زندگی اور زندگی کی قدروں کو پاؤں تلے روندتے چلے گئے۔

ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ بدحواس ہو کر بھاگنے کی بجائے ڈھاکہ ائرپورٹ کو تباہ کر دیتے تو اس بڑے پیمانے پر ملٹری ایکشن لینا خاصا دشوار ہو جاتا۔ مگر ہوا یہ کہ بزدل باغی جہاں گئے۔ وہاں نہتے، معصوم لوگوں کے کُشتے کے پُشتے لگا دیئے — ہنستی کھیلتی زندگی سے ہمکتی آبادیاں قبرستان بن گئیں۔ ایسے قبرستان جہاں بجائے دفن ہونے کے لاشیں زمین پر پڑی سڑ رہی تھیں اور انہیں کوئی اٹھانے والا نہ تھا۔ غیر بنگالیوں کی ان آبادیوں میں تعفّن پھیلا ہوا تھا۔ جب پاکستان آرمی کے جوانوں نے جا کر اجتماعی قبریں بنائیں اور لاشوں کو جمع کر کے ان میں انسان نما بھیڑیوں کے نخچیروں

کو سپردِ خاک کیا۔ چونکہ کام بہت زیادہ تھا لہٰذا کئی جگہوں پر زیادہ گہرے گڑھے نہ کھودے جا سکے اور ایک نازک سا ہاتھ ایسی ہی قبر سے باہر نکلا دیکھ کر ہی کسی نے فی البدیہہ غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے :

ع وہ رنگِ حنا ہو کہ لہو جم سا گیا ہو
ان نقرئی ہاتھوں کو مگر دیکھ رہا ہوں

یہ سب حالات سن کر کس کا دل خون کے آنسو نہ روئے گا اور کس کے تن من میں تنفر کا الاؤ نہ جل اٹھے گا۔ پھر یہ ہوا کہ ظلم وستم کرنے والے بھیڑیئے یا تو مخفی غاروں میں جا چھپے یا خطۂ غیر میں فرار ہو گئے۔ مگر پُرامن اور بے گناہ شہری نفرت کی اس آگ کی تپش کے حصار سے نہ بچ سکے۔ اور یہ وہ نازک نقطہ ہے جہاں سے ہمارے قومی المیہ نے ایک بالکل نیا رُخ اختیار کیا۔

ناگہاں اس رنگ سے خونبانہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

ہم جب ڈھاکہ میں گئے تو غصّے اور نفرت کی نامعلوم سی آنچ رگ و پے میں سرایت کی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری شام جب ہم مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری مسٹر شفیع الاعظم صاحب کے ہاں ملاقات کے لئے گئے تو میں نے بڑے وثوق اور خود اعتمادی کے ساتھ ان سے کہا کہ "بنگال کے ہاتھ معصوموں کے خون سے کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ بنگال خود کو کیسے بری الذمہ قرار دے سکتا ہے۔ جبکہ اس نے اپنے بے گناہ بھائیوں کے خون سے اس بے دردی سے ہولی کھیلی ہے؟" وہ سختی سے منہ بھینچے ہوئے خاموش رہے —— میں نے انہیں ایک عریاں اور ہیبت ناک حقیقت کے سامنے لاجواب سمجھا۔ غالباً مصلحت وقت انہیں زبان بندی پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ وہ تو مانے ہوئے دھڑلے کے آدمی تھے۔

گو ہمارے گھر کے اندر خوب چہل پہل تھی۔ مگر پھر بھی انجانے طریقے پر در و دیوار سہمے ہوئے تھے۔ فضا انجانے دکھ سے بوجھل رہتی۔ زندہ تو بہر طور رہنا تھا۔ ہم سب ملتے تو ہنستے بولتے بھی۔ مگر گرد و پیش کا بوجھل پن ہمارے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے بہت وسیع لان تھا۔ لان کے بائیں کونے پر عبدالرب چودھری کا مکان اس طرح واقع تھا کہ اس کی بالائی منزل سے ہمارے باغ کی روشیں، گیٹ سے شروع ہو کے پورچ میں سے گزر کر اس مکان کے پچھواڑے تک جاتی ہوئی پکی سڑک اور سامنے کا برآمدہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہم لوگ شام کے وقت گھر کے اندر اس پکی سڑک پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔

عبدالرب چودھری صاحب کے ساتھ اسلام آباد میں کئی برس اکٹھے گزرے تھے۔ ڈھاکہ میں بھی ان کا پڑوس ملا۔ میں بہت خوش تھی کہ ایک بنگالی دوست ساتھ رہ رہے ہیں۔ آتے ہی مسز رب چودھری کو فون کیا تھا۔ ان کے ردِّ عمل میں وہی پہلے والی گرمجوشی تھی۔ تیسرے روز اتوار تھا۔ وہ لوگ ملنے آئے۔ دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوتی رہی۔ یکدم عبدالرب نے میری طرف منہ کر کے کہا۔ "بھابی! کل شام آپ جب باہر ٹہل رہی تھیں تو میں بالائی منزل سے دیکھ رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ بالکل میری رینج (یعنی بندوق کی گولی کی پہنچ) میں تھیں" اور پھر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا — میرے شوہر سخت طیش میں آ گئے — عبدالرب معذرت کرنے لگا کہ وہ تو محض مذاق کر رہا تھا — اور میں دنگ رہ گئی کہ دوستوں کی سوچ کے دھارے اب مذاق میں بھی یہ رُخ اختیار کرتے ہیں —!! بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم لوگ مثلِ سابق ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے۔ مگر عبدالرب کا وہ مذاق میرے ذہن سے کبھی نہ محو ہو سکا۔

ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایچ آر ملک صاحب اور قاضی جلال الدین صاحب اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے۔ ان حضرات کے ساتھ ہم نے بہت اچھے دن گزارے تھے۔ پرانی دوستی کی بہت خوش اسلوبی سے تجدید ہوئی۔ ملک صاحب جو آڈانگہ کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کی تعلیم الہ آباد میں ہوئی تھی۔ تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ پہلے بھی ان کی دوستی زیادہ تر مغربی پاکستانی ساتھیوں سے تھی۔ اب بھی ان کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا۔ مسز ملک کے والد ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے تعمیر پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اب وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ مگر ان کے نظریات کا تانا بانا اب بھی پاکستان کی یک جہتی کے ساتھ جا ملتا تھا۔ اور وہ موجودہ سیاسی طوفان کے باوجود اپنے نقطۂ نظر میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

ملک صاحب کی دونوں بیٹیاں لوکھی اور ٹینتھی اب جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ایک دس بارہ برس کا بیٹا بابو آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ہمارے بڑے بیٹے پپّو کی بچپن کی ان سے دوستی تھی۔ اب جب یہ سب بچے سمجھدار ہو چکے تھے تو ان کی دوستی میں بھی پختگی آگئی۔ پپو قریباً روز شام کو سائیکل پر ملک صاحب کے ہاں چلا جاتا۔ یا بابو اسے بلانے آجاتا۔ حالانکہ ان حالات میں تنہا سائیکل پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مگر مسز ملک اپنی بالکونی پر کھڑی اسے دیکھتی رہتیں۔ جب تک وہ گھر کے احاطہ میں داخل نہ ہو جاتا۔ ملک صاحب کے گھر میں ہمیں ہمیشہ عزیزوں کا سا خلوص اور پیار ملا۔

ملک صاحب کا فلسفہ یہ تھا کہ یہ جنگ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باشندوں میں نہیں ہے بلکہ "ہیوز" (معاشی وسائل کے مالکوں) اور "ہیونالٹس" (معاشی وسائل سے محروموں) کے درمیان ہے۔ اس کا ثبوت وہ اس طرح دیتے کہ

اگر کوئی کار کا مالک سڑک پر کسی قسم کی کوئی غلطی کر بیٹھے تو بغیر یہ پوچھے کہ وہ بنگالی ہے یا غیر بنگالی، عام لوگ کووں کی طرح جمع ہو کر اس کی تکا بوٹی کرنے کے متعلق سوچنے لگ جاتے ہیں۔ اپنی بات کے حق میں وہ اور بھی دلیلیں پیش کرتے۔ ملک صاحب بنیادی طور پر ایک خوش فہم اور نیک پاکستانی تھے۔

قاضی جلال الدین کی زندگی کے اصول ہمیشہ مصلحتوں کے درمیان مقید رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم لوگ لندن، چٹاگانگ اور کاکسز بازار میں اکٹھے بلکہ ایک ہی مکان میں عرصۂ دراز تک رہ چکے تھے۔ مگر ہمارے درمیان دوستی کی بنیادیں بے لوث خلوص پر استوار نہ ہو سکیں۔ ہماری دوستی مروّت سے زیادہ رسمِ زمانہ کی پابند تھی۔ ڈھاکہ میں ہماری دوستی کی، ان ہی سابقہ خطوط پر تجدید ہو گئی۔

مشرقی پاکستان میں مارشل لا صحیح معنوں میں نافذ تھا۔ لوگ بتاتے تھے کہ ۲۵ر مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد دس پندرہ روز تک تو ہر وقت "ڈز، ڈز" کی آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ فضا میں خاموشی چھانی شروع ہو گئی۔ اب یعنی جولائی میں ڈھاکہ کے حالات خاصے نارمل ہو چکے تھے۔ گو ابھی شہری زندگی پر تعطل چھایا ہوا تھا سکول و کالج بند تھے۔ عدالتیں بند تھیں۔ البتہ دفاتر کھلے تھے۔ سڑکیں و گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ بازار کی کچھ دکانیں کھلی اور کچھ بند پڑی ہوتی تھیں۔ سوائے خورد و نوش کی اشیاء کے اور کسی چیز کے خریدار نہ تھے۔

تین جولائی کو میری دوست سعدیہ بنکاک سے لاہور جاتے ہوئے اپنے شوہر عابد کے ساتھ ایک روز کے لئے ڈھاکہ میں میرے پاس رکی۔ پٹھان لڑکی نے پورے شہر کی سیر کی ٹھانی۔ بہت منع کیا۔ مگر اس ضدی لڑکی نے مرغے کی ایک ٹانگ کے مصداق اپنی ضد کو نہ چھوڑا۔ ناچار مجھے بھی ساتھ دینا پڑا۔

پہلے ہم ڈھاکہ اسٹیشن پہنچے۔ وہ جگہ جو زندگی کی چہل پہل کا مرکز تھی، سنسان پڑی تھی

کوئی قلی، کوئی خوانچے والا اور کوئی مسافر نہ تھے۔ ریلوے کا عملہ بھی غالباً کہیں کمروں میں ہوگا۔ اس وقت کسی ٹرین کے آنے کا وقت نہ تھا۔ مجموعی طور پر ماحول ایسا تھا جیسے ابھی کوئی جنازہ یہاں سے اٹھا ہو۔

شہر کے اس کنارے سے اس کنارے تک چلے گئے۔ بڑی بڑی عمارتوں پر کثرتِ باراں سے جمی ہوئی کائی ماحول کی ویرانی میں اضافہ کا باعث بن رہی تھی۔ چمکتے ہوئے گہرے ہرے رنگ کا سبزہ اور عجیب طرح کا سناٹا، جنوں بھوتوں والی پُراسراریت کا مظہر تھا اور سعدیہ نے رسان سے اعلان کر دیا کہ "ڈھاکہ ہرگز خوبصورت جگہ نہیں ہے تم خواہ مخواہ اس کے حسن کے قصّے سنایا کرتی تھیں۔"

خدا کا شکر ادا کیا۔ جب ہم بوڑھی گنگا کے صدر گھاٹ پر پہنچے اور زندگی کے آثار نظر آئے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ پورے شہر میں صرف اسی جگہ چہل پہل تھی۔ مسافر آ جا رہے تھے، سامان اسٹیمروں میں لادا جا رہا تھا اور گھاٹ کی مخصوص صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ سہمی سہمی، ڈری ڈری زندگی میری دوست کو بالکل پسند نہ آئی —

"بھئی لاہور کی کیا بات ہے۔" کہہ کر سعدیہ بیگم دوسری صبح خطۂ لاہور کے لئے پرواز کر گئیں۔ لیکن ہمیں تو اس ماحول سے جہاں کے ہر برگ و شجر پہ یاسیت طاری تھی۔ سمجھوتہ کرنا ہی تھا۔

کمشنر ہاؤس کی بالائی منزل پر ہم رہ رہے تھے اور نچلی منزل میں چودھری صاحب۔ یوں تو کھانا پکانے کا بندوبست علیحدہ علیحدہ تھا۔ مگر عموماً رات کا کھانا دونوں باورچی خانوں سے آ کر ایک ہی میز پر لگ جاتا۔ اور جتنے بھی دوست اس وقت موجود ہوتے اس دعوت شیراز میں شریک ہو جاتے۔ چودھری صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ان کی وجہ سے حالات کے بوجھل پن میں کافی لطافت آ گئی تھی۔ ثریا بھابی ایک خوبصورت اور بے لوث شخصیت کی حامل ہونے کے علاوہ ایک قابل اعتماد دوست تھیں۔ تصنع

اور بناوٹ سے دُور، ان کی سادہ طبیعت میں ایسی کشش تھی کہ چند روز کے ساتھ نے یہ احساس دلا دیا۔ جیسے ہم برسہا برس سے ایک دوسرے کے دوست ہوں۔

میرے شوہر اور چودھری صاحب باہم دورے پر جاتے۔ انہوں نے ۷ر جولائی کو مانک گنج کا دورہ بنایا۔ ان دنوں ملٹری ایکشن کے بعد بنگالی تخریب کار بظاہر انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے۔ مگر ان کی تنظیم جسے "مکتی باہنی" (یعنی نجات دہندہ فوج) کہتے تھے آہستہ آہستہ خفیہ طور پر جڑیں پکڑتی معلوم ہو رہی تھیں۔ مگر ابھی تک مکتی باہنی کے سرکردہ رکن ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ اور بنگال پولیس کے مسلح فرار شدہ افراد ہی تھے۔ بنگال کے عام شہری ابھی بڑے پیمانے پر اس تحریک میں شامل ہونا شروع نہ ہوئے تھے۔ ضلع ڈھاکہ کی سب ڈویژن مانک گنج کا علاقہ مکتی باہنی کے تخریب کاروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کے لیڈر کا نام کیپٹن حلیم بتایا گیا۔

چھریرے بدن اور غیر معمولی طور پر کھلتے ہوئے رنگ کا کثیر الاولاد کیپٹن حلیم مانک گنج کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا باسی تھا۔ بے حد جوشیلا اور جذباتی طبیعت کا مالک، اپنی معیشت پر ہندوؤں کی بالادستی سے نہ صرف باخبر بلکہ ان کے سخت خلاف۔ پکا مسلمان اور سچا پاکستانی — میرے مالک وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے کیپٹن حلیم جیسے شخص کو علاقے کی مکتی باہنی کا سرغنہ بنا دیا۔

اس کا صحیح تجزیہ تو میں نہیں کر سکتی۔ مگر کچھ یوں سمجھ میں آیا کہ

(۱) بنگالی اپنی زبان اور کلچر سے مجنونانہ پیار کرتے تھے مگر مغربی پاکستانی بھائی جو وہاں اہم فوجی و سول عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے بنگال کے کلچر کی سادگی کو ہمیشہ گنوار پنے اور اجڈ پن سے تشبیہ دی۔ اس طرح پیدا کی گئی زبان و کلچر کی خلیج نے دونوں حصوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دیا۔

(۲) ایوب خاں صاحب کے دور میں مرکزی حکومت میں غلط قسم کی نمائندگی اور عوام کی آواز کی نارسائی ایسی کسک تھی جو دھیرے دھیرے جان لیوا کینسر کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ پاکستان کے دشمن جو بظاہر دب گئے، تھے اندر ہی اندر پاکستان کی جڑیں کاٹنے کے لئے سازش کے تیشے تیز کر رہے تھے۔ وہ عوام کے غیر مطمئن جذبات کے اس ناسور کو نہایت گہری چال، اور چابکدستی کے ساتھ باقاعدگی سے نشتر زنی کرتے رہے مگر اس کی صحیح اطلاع کبھی بھی حکومت کو نہ مل سکی، دونوں بازوؤں کا شہری سطح پر رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

(۳) اس کا کوئی مستند ثبوت تو میرے پاس نہیں۔ مگر مختلف جرائد و اخبارات سے اخذ کی گئی خبر یہ تھی کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کی حفاظت کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تھی اور جب قومی اسمبلی میں یہ سوال اٹھایا گیا تو حکومت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی حفاظت کرنا اس وقت ممکن نہ تھا۔

یہ سیاسی نوعیت کا انتہائی غیر دانشمندانہ جواب تھا۔ اس جواب نے پڑھے لکھے بنگالی طبقے کو بہت مشتعل کر دیا۔ اکثر بنگالی افسران کو یہ کہتے سنا گیا کہ "جس فوج سے ہمیں جنگ کے دوران حفاظت نہیں مل سکتی۔ اس سے ہمیں کیا فائدہ؟ — اور اس پر ہمارا زرمبادلہ کیوں خرچ کیا جائے"۔ اس بات نے فوج میں موجود بنگالی اور مغربی پاکستانی افراد میں تفریق پیدا کر دی تھی۔ اور ایک ہی ڈسپلن والی قوت کے رکن ہوتے ہوئے بھی ان کے زاویے، ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو گئے۔ آخر یہی جداگانہ طرزِ فکر و عمل بغاوت کا محرک بن گئی۔

(۴) ملک دشمن عناصر نہایت عیاری و دانشمندی سے پاکستان کو تباہ کرنے کا

منصوبہ مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے دلوں میں
مغربی حصّے کے بھائیوں کی طرف سے نفرت
کی آگ تو بھڑکا ہی دی تھی۔ مگر یہ جانتے تھے کہ مسلح افواج کی موجودگی میں
نہتے عوام کی بغاوت زیادہ فیصلہ کن نہ ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے بنگالی مسلح
قوتوں کو سب سے پہلے بغاوت پر آمادہ کیا۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ حقیقت یہی تھی کہ حلیم چودھری جیسے کٹر پاکستانی فوجی بھی مکتی
باہنی میں شامل ہو گئے تھے۔ چونکہ حلیم ہمارا دوست تھا۔ لہٰذا اس دورے کا مقصد
ایک یہ بھی تھا کہ میرے شوہر حلیم کو سمجھا بجھا کر ان تخریبی سرگرمیوں سے باز رکھیں۔

سب احباب کے منع کرنے کے باوجود میں اور ثریا بھابھی بھی ان لوگوں کے ساتھ
مانک گنج گئے۔ یہ دورہ ہماری زندگی کا ایک بہت تجرباتی واقع تھا۔

تین لانچیں ایک ساتھ روانہ ہوئیں۔ ہم اُسی چھوٹی سی لانچ "اسٹیلا" میں گئے جو
ہمارے ایس ڈی او کے زمانے میں ہماری مستقل ہم سفر رہی تھی۔ دوسری لانچ میں
چودھری صاحب اور فیملی تھے اور تیسری میں ڈھاکہ کے ڈپٹی کمشنر اور ڈی آئی جی
پولیس سوار تھے۔

مون سون کا زمانہ تھا اور ہم لوگ بہاؤ کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ یوں بھی
دریائی راستہ بہت پیچدار اور لمبا ہوتا ہے۔ اکثر میلوں کا پیچدار سفر طے کرنے کے بعد
دریا کا موڑ تقریبًا اسی جگہ لے آتا ہے جہاں سے ایک آدھ گھنٹہ پیشتر گزرے تھے۔

دریا میں مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں اسی طرح مصروف کار تھیں۔ مسافر لانچیں آ
جا رہی تھیں۔ دریا کے کنارے اونچائی پر کیلے اور ناریل کے پیڑوں سے ڈھکے ہوئے
"بالسنوں" اور کھپریل سے بنے ہوئے گھروں پر مشتمل گاؤں اسی طرح موجود تھے۔ گہرے
رنگ کی دھوتیوں میں ملبوس عورتیں، بچوں کو کولہوں پر جمائے اسی حیرت کے ساتھ

ہمیں لانچ کے ڈیک پر بیٹھا دیکھ رہی تھیں۔

اسٹیلا لانچ کا سارنگ بھی وہی تھا۔ صرف اس کے چہرے کے ٹھہرے ہوئے پختہ نقوش اور سفید بال یہ اعلان کر رہے تھے کہ اس جواں سال سارنگ کی جگہ عمر رسیدہ انسان نے لے لی تھی۔ لانچ کے عملے کے باقی افراد بھی وہی تھے اور ان سب لوگوں نے ہمیں اسی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا تھا۔ یہ سارنگ ہمیشہ کی طرح پانچ وقت کا نمازی تھا۔ ہر نماز کے وقت سارا عملہ ڈیک کے کسی گوشہ میں اسی طرح باجماعت نماز ادا کرتا۔

سب کچھ بظاہر وہی تھا۔ صرف ہمارے دلوں میں اپنے ہی وطن میں غریب الوطنی کا شدید احساس اور عجیب سا — اجنبی سا خوف گامزن تھا۔

ہمارا مانک گنج پہنچنے کا وقت ۵ بجے تھا۔ مگر جولائی میں دریا کے دھارے کی شدید مخالفت کے باعث رفتار بہت سست رہی اور ہم وہاں رات کے ۸½ بجے پہنچے۔

ان حالات میں رات کے اس پہر میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے شوہر کنارے پر جائیں۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہاں کے سب لوگ بڑی اپنائیت سے کئی گھنٹوں سے میرے منتظر ہیں — اگر اس وقت وہاں نہ جاؤں تو ایک تو ان کو بہت مایوسی ہوگی۔ دوسرے یہ بے جا خوف و بزدلی کا مظاہرہ لوگوں اور میرے درمیان بے اعتمادی کی دیوار حائل کر دے گا۔

لہٰذا وہ چھوٹی موٹر لانچ پر سوار ہو کر کنارے کی طرف گئے۔ میں ڈیک پر بیٹھی دبے دبے خوف اور دھڑکتے دل کے ساتھ موٹر لانچ کو جاتے دیکھتی رہی۔ کنارے پر گیس کی کافی روشنی اس بات کی شاہد تھی کہ لوگ واقعی انتظار کر رہے تھے اور پھر ان کی جیپ شہر کی جانب جاتی ہوئی دیکھی۔ ۱۹۵۷ء میں مانک گنج میں تو پگڈنڈیاں بھی

اس موسم میں پانی میں ڈوب جایا کرتی تھیں۔ چہ جائیکہ جیپ وہاں چلتی ہوئی دیکھی۔ یعنی پکی سڑکوں کی تعمیر کا واضح ثبوت ــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہر طرف بے اندازہ مادی ترقی ہو چکی تھی۔

اس شب چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر تھا چاروں طرف پانی میں چاندنی منعکس ہو کر دُور تک چاندی کی چادر پھیلا رہی تھی۔ پورے ماحول پر پریوں کی کہانیوں والا سحر طاری تھا۔ ایسا حُسن جو فطرت کبھی کبھی لٹاتی ہے ــــ برسات کے زمانہ میں بنگال میں اس طرح شفاف آسمان جب کہ ایک ننھی منی بدلی بھی نہ ہو ذرا کم ہی ہوتا ہے۔

میں کبھی اس خنک اور خوشگوار فضا کے سحر زدہ حُسن سے مسحور ہوتی اور کبھی یک دم کنارے کی طرف آنکھیں لگ جاتیں اور میں چونک کر آیتُ الکرسی پڑھنے لگتی ــــ دس بجے تک تو کسی نہ کسی طرح وقت گزر گیا۔ مگر اس کے بعد ایک ایک لمحہ ایک صدی بن کر گزرنے لگا۔ مکتی باہنی کی سرگرمیوں کے مرکز میں ایک مغربی پاکستان سے آئے ہوئے افسر کا یوں تنہا نصف شب کو چلے جانا ــــ میں ذہن ہی ذہن میں تجزیہ کرتی تو عقل اور سمجھ کی کوئی دلیل اس کے حق میں نہ پڑتی۔ نظریں کنارے پر مرکوز تھیں۔ خدا خدا کر کے ساڑھے گیارہ بجے جیپ شہر سے لوٹی اور کنارے کے اونچے اونچے پٹ سن کے کھیتوں میں سے روشنیاں نظر آنے لگیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ وہی موت و زیست پر قادر ہے اس کی حفاظت میں کِس کو زک پہنچانے کی مجال ہے!۔

میرے شوہر نے آکر بتایا کہ لوگوں نے بہت خلوص کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ میٹنگ کے بعد ایس ڈی کے گھر میں یاد ماضی تازہ کرنے گئے، اور وہاں سے کلب چلے گئے۔ مقامی مسائل زیر بحث رہے۔ لوگ اپنے ذاتی حالات بھی بتاتے رہے۔ موجودہ حالات کے علاوہ پرانی باتیں بھی دہرائی گئیں۔ میرے شوہر کے بقول بظاہر تو لوگوں کے رویے

میں وہی پرانا خلوص اور اپنائیت تھی۔ دلوں کی خدا ہی جانے۔

دوسرے روز علی الصبح چودھری صاحب اور میرے شوہر دورے کی غرض سے شہر میں چلے گئے۔ دس بجے کے قریب ایک چھوٹی لانچ آکر رکی۔ دیکھا تو تمام پرانے ملازم حتیٰ کہ جمعدار معہ اپنی بیوی بُدیا کی ماں کے ملنے آئے تھے۔ ہمارے زمانے کے اسسٹنٹ ناظر اب ناظر ہو چکے تھے وہ بھی آئے۔ بنگالی رسم کے مطابق بطور احترام دھڑا دھڑ پاؤں چھوئے (ہندوؤں کی یہ رسم بنگالی مسلمانوں نے اس عقیدہ سے اپنائی تھی۔ جیسے ان کے اپنے مذہب کا یہ جزو ہو) بُدیا کی ماں اور میرا پرانا ملازم حبیب خوب روئے (یہ بھی محبت اور عزت کا اظہار تھا)۔ بُدیا کی ماں کمال محبت سے ایک بڑا سا فضلی آم اور دو کچے ناریل بطور تحفہ لائی تھی۔ جو کہ مجھے اس کا دل نہ توڑنے کے خیال سے رکھنا پڑا۔ حبیب اپنے بیٹے کو ساتھ لایا تھا۔ جس نے اُسی سال بی اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ ناظر صاحب کی تین بیٹیاں تھیں۔ ایک لیڈی ڈاکٹر بن چکی تھی اور دو نے ایم اے پاس کر لیا تھا اور تینوں اپنی اپنی جگہ خوش حال اور مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ میں نے بنگال میں مرد و زن میں تعلیم کے بدرجۂ اتم شوق کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ان لوگوں کی سادگی اور علم کی جستجو ہماری چھوٹی نمائش کی ریس کو ایک نہ ایک دن مات دے جائے گی۔

کیپٹن حلیم چودھری کی میرے شوہر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اس علاقے کو ہمارے جانے سے پہلے چھوڑ کر کہیں اور جا چکا تھا۔ میرے شوہر نے اسے کہلوا کر بھیجا کہ "تم اتنے سچے پاکستانی تھے۔ تمہیں یہ کردار مناسب نہیں ہے۔ ملک سے غداری تمہیں راس نہ آئے گی۔ تم اپنی حرکتوں سے توبہ کر کے میرے پاس ڈھاکہ آجاؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تمہیں متعلقہ حکام سے معافی دلوا دوں گا۔ تاکہ تم عزت دار شہری کی طرح۔ مثلِ سابق زندگی گزار سکو"۔ میں نے سنا کہ حلیم کو یہ پیغام ملا، تو

وہ خاموش ہوگیا۔ اور پھر اس نے اپنی طرف سے دوستی کا حق یوں ادا کیا کہ اس علاقے سے اپنی تخریبی سرگرمیاں ترک کر کے بھارت فرار ہوگیا۔

اس دورے سے واپس آکر میرے تاثرات یہ تھے کہ گو پڑھے لکھے لوگوں کو سیاسی سطح پر مغربی پاکستان سے شکایات ضرور ہیں مگر اب بھی پچاس فی صد لوگ پاکستان کے وفادار ہیں۔ یہ امر قابل غور رہے کہ ہمارے حکام نے سب علاقوں میں جو پیس امن کمیٹیاں بنادی تھیں۔ عوام اِن پیس کمیٹیوں کے سربراہوں سے بہت نالاں تھے۔ اکثر پیس کمیٹیوں کے ممبروں نے ہندوؤں اور دیگر بھارت چلے جانے والے لوگوں کی جائیدادیں اور مکانات ہتھیا لئے تھے: جو شخص ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف زبان کھولے، اس کا نام تخریب کاروں کی فہرست میں لکھ کر فوج کو دے دیتے۔ ورنہ درحقیقت کسی ایک تخریب کار کا بھی یہ کھوج نہ لگا سکتے تھے۔ بس معصوم شہریوں کو ذاتی دشمنی کی بنا پر مروا رہے تھے۔ پیس کمیٹیوں کے ممبروں کی طرف سے چاروں طرف خوف اور تنفّر پھیل رہا تھا۔

(ہمارے حکام کے پاس مکتی باہنی یا دوسرے لفظوں میں لفظ "تخریب کار" کی حدود متعیّن نہ تھی۔ اور یہ حقیقت آگے چل کر ہمارے قومی المناک سانحہ کا پیش خیمہ بن گئی)

مجموعی طور پر یہ دورہ خاصا کامیاب رہا۔ اس دورے کے بعد مانک گنج کے علاقے سے تخریب کاروں کی سرگرمیاں بہت کم ہوگئیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ پرانے جاننے والوں سے مل کر ہمارے دلوں سے خوف کافی حد تک کم ہوگیا۔

دن کسی نہ کسی طرح گزر رہے تھے۔ دن بھر میں اور ثریا بھابی بچوں کے ساتھ حالات سے آنکھیں بند کر کے مصروف رہتے۔ ہمارے پاس آرائش کی کوئی خاص چیزیں نہ تھیں۔ لے دے کے ایک چیز جو کمشنر ہاؤس میں فراواں تھی وہ تھا منی پلانٹ ــــ

پورچ کی سیڑھیوں پر دونوں جانب بے شمار منی پلانٹ تھا۔ ہم ہر جگہ بوتلوں، گلاسوں اور مٹی کے پیالوں میں وہی سجا دیتے۔ جس کے پاس جو بھی چھوٹی موٹی آرائش کے قابل چیز تھی وہ ڈرائینگ روم میں آجاتی۔ ایک روز میں سنٹرل ٹیبل پر ایک کھلے سے پیالے میں پانی ڈال کر گلدستہ سجا رہی تھی۔ یہ پیالہ بیضوی تھا۔ ایک طرف پھول سجانے کے بعد دوسری طرف کا پانی خالی بچ گیا تھا۔ چودھری صاحب کی دس بارہ سالہ بچی گولڈی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ بھاگی گئی اور اپنے کمرے سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی بطخ اٹھا لائی۔ اور بڑی معصومیت سے پانی میں اسے چھوڑ کر میری طرف ستائش بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ "آنٹی یہ اچھی لگ رہی نا — !" اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے تحفے کو کم نہ سمجھا جائے — "ارے یہ تو بہت ہی خوبصورت لگ رہی ہے گولڈی بھئی تم تو بہت آرٹسٹک مزاج رکھتی ہو ابھی سے —" بچی کی خوشی کے مارے گالیں سرخ ہو گئیں —

اس طرح سادہ سے برتنوں کے سیٹ خرید لئے تھے۔ جن کا مقصد زندگی کا معمول "چالو" رکھنا تھا۔ البتہ شام کو ہمارا ڈرائینگ روم مختلف النوع دوستوں سے بھر جاتا۔ پولیس افسر، سول انتظامیہ کے افراد۔ مسلح قوتوں کے افراد اور مقامی حضرات سب ہی یک جا جمع ہو جاتے۔ ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو ہوتی — ادب و کلچر کے موضوعات بھی زیر بحث آتے اور حالاتِ حاضرہ پر بھی تبصرہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ نشستیں ہی میرے لئے اطلاعات کا مرکز ثابت ہوئیں۔ مقامی حالات کافی حد تک معمول پر آچکے تھے۔ مگر ابھی تک نہ سکول کھلے تھے اور نہ سڑکوں پر آمدورفت عام ہوئی تھی۔ خواتین کا سڑکوں پر نکلنا تو بالکل مفقود ہو چکا تھا۔ چونکہ عورت کا بلا خوف باہر نکلنا بھی نارمل حالات کا ایک ثبوت ہوتا ہے۔ لہٰذا مسعود مفتی نے ان کا نام ہی "نارملیسی" رکھ دیا تھا۔ جب بھی کبھی سڑک پر عورتوں یا کسی لڑکی

کو دیکھتے تو ضرور اطلاع دیتے کہ آج تو " نارملیسیاں" نظر آئی تھیں۔

سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھلنے کی مقررہ تاریخ کا اعلان کیا گیا۔ مقامی لوگوں کو احکام بھیجے گئے کہ وہ اپنے بچوں کو ضرور تعلیمی اداروں میں بھیجیں ــــ ساتھ ہی ساتھ مکتی باہنی کی طرف سے تمام بنگالی افسروں کو خطوط آئے کہ اگر انہوں نے اپنے بچوں کو سکول بھیجا تو انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ یہ خطوط عجیب پُراسرار قسم کے تھے ان سب کی زبان اور مضمون یکساں تھا۔ خط میں سفید لٹھے کا ایک ننھا سا ٹکڑا بھی کفن کی نشانی کے طور پر منسلک ہوتا۔ ان خطوط نے سب کو ہراساں کر رکھا تھا۔ ہمارے بنگالی دوست بچوں کی تعلیم کے متعلق بھی پریشان تھے۔ اور ان کی جان کا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ عجیب گو مگو کا عالم تھا۔

حکومت پاکستان کے دفاتر کھلے تھے۔ کچھ بنگالی ملازمین زیر زمین روپوش ہو چکے تھے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ لوگ جو ہنوز حکومت کی ملازمت میں تھے اور باقاعدگی سے دفتروں کو جا رہے تھے انہیں اسی طرح سے پُراسرار قسم کے خطوط موصول ہو رہے تھے وہ بھی تذبذب میں تھے۔ اپنی عمر بھر کی کمائی ہوئی ملازمت سے بھی ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تھے اور جان بھی انہیں عزیز تھی۔

یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بیشتر بنگالی ملازمین خواہ وہ مسلح افواج سے وابستہ تھے یا سول انتظامیہ اور عدلیہ سے، ان کی وفاداریاں حکومت پاکستان کے ساتھ نہ رہی تھیں۔ اس کا ثبوت یہ دیا جاتا تھا کہ سول و فوجی سطح پر کسی قسم کا بھی منصوبہ بنے، اسے کتنی بھی راز داری میں رکھا جائے اس کی اطلاع غیر حکومت کو ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات یہاں تک دیکھنے میں آیا کہ ابھی منصوبہ پر عملدر آمد شروع بھی نہیں ہوا کہ اغیار کے ریڈیو کی آواز اس کا اعلان کر دیتی۔ یہ بھی کہا جاتا کہ اوپر اوپر سے جو ہمارے ساتھ ہیں وہ درحقیقت ہمارے ساتھ نہیں ــ یہ لوگ محض وقت کی

مصلحت اور ہوا کا رُخ دیکھ رہے ہیں۔ جب بھی مکتی باہنی کا یا علیحدگی پسند عناصر کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ یہ ادہر چلے جائیں گے۔

مگر یہ فارمولا سب پر صادق نہ آتا تھا۔ ابھی تک چند ایک ایسے حضرات بھی تھے جو دل و جان سے پاکستان کے ساتھ تھے۔ ان کی وفاداریاں مصلحت کے تابع نہ تھیں بلکہ ابھی تک ملک کے لیئے ہر قربانی دینے کو تیار تھے۔ اس فہرست میں صرف وہ بہاری نہیں آتے جو تقسیم ہند کے بعد اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آ بسے تھے اور جن کی موت و حیات پاکستان کے ساتھ وابستہ تھی اور جنہیں مقامی انقلاب کوئی مقام دینے کو تیار نہ تھے بلکہ اس میں چند ایسے بنگالی بھی شامل تھے۔ جن کے لیئے قیامِ پاکستان، نظریۂ اسلام کا مظہر و واضح اعلان تھا۔ جن کے لیئے پاکستان سے علیحدگی اسلامی اصولوں و قدروں سے دوری تھی۔ اس لیئے وہ مسلمان فرض کے طور پر پاکستان کے حامی اور وفادار تھے۔ ہمیں کئی ایسے ثبوت ملتے ہیں جب کہ بنگالیوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر غیر بنگالیوں کی حفاظت کی — میمن سنگھ جہاں بربریت کا بدترین مظاہرہ ہوا تھا۔ وہاں چار سویلین مغربی پاکستانی افسر تعینات تھے۔ ان چاروں کو بنگالی ڈپٹی کمشنر نے اپنی جان پر کھیل کر بچایا تھا۔ اسی طرح ایک مسلم لیگی تحصیلدار نے پاکستان کی اتنی حمایت کی کہ مکتی باہنی والوں نے اس کے والدین اور بیوی بچوں کو سزا کے طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر بھی جب وہ میرے شوہر کے پاس آیا تو صبر و قناعت کی ایک تصویر تھا۔ کسی علاقہ یا طبقہ کے تمام افراد پر ایک ہی اصول صادر نہیں کیا جا سکتا کہ اچھے اور برے لوگ تو ہر جگہ اور ہر طبقہ میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے تناسب میں حالات کے مطابق ردّو بدل ہو سکتا ہے کہ ؎

نہ ہر زن، زن است، نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت، یکساں نہ کرد

ابھی تک مشرقی پاکستان میں سول حکومت کے سربراہ جنرل ٹکا خان صاحب تھے اور فوج کے سربراہ جنرل نیازی صاحب۔ گو حکومت کا رنگ سراسر عسکرانہ تھا۔ فوج کی بالادستی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ ہر معاملہ میں خواہ وہ کسی محکمہ سے تعلق رکھتا ہو، فوجی نظریہ و رائے کی حیثیت حتمی حکم کی تھی۔ مگر پھر بھی اقتدار حکومت دو مقتدر اور قومی ہستیوں میں منقسم تھا۔ شہریوں کی دادرسی، ٹکا خاں صاحب خوب کرتے اور یہ سنا گیا تھا کہ سول کے ہر معاملہ میں فیصلہ صادر کرنے سے پیشتر متعلقہ افراد سے رائے ضرور لیتے۔

ان دنوں کلکتہ اور چوآڈانگہ کے بارڈر پر سُنا تھا کہ کسی ٹرک کے اوپر ریڈیو بنگلہ دیش قائم کیا گیا تھا۔ یہ متحرک ریڈیو سٹیشن پاکستان کی حدود سے باہر تھا۔ مگر دعویٰ یہی کیا جاتا کہ یہ پاکستان کی حدود کے اندر ہے۔ یہ ریڈیو سٹیشن پاکستان کے خلاف بہت زہر پھیلا رہا تھا۔ اس ریڈیو کا پورا زور ٹکا خان صاحب کی شخصیت کو منہدم کرنے پر صرف ہوتا۔ انہیں بنگالی نظموں اور تقریروں میں قصائی، ہلاکو خان اور تاریخ کا ظالم ترین شخص کہا جاتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ تھے جس میں حکومت کے سویلین ملازمین خود کو محفوظ محسوس کرتے۔ وہ ایک ایسا مرکز تھے جن کی جانب ایک شہری کسی نہ کسی طور اپنی فریاد لے کر آسکتا تھا۔ لیعنی کم از کم یہ ممکن ضرور تھا......

یہ اور بات ہے کہ دیگر عناصر نے اس مرکز تک عام شہری کی رسائی دشوار ترین مرحلہ بنا دی تھی۔ مگر اس حقیقت سے بھی گریز نہیں کہ جب بھی شہریوں کے ساتھ کسی ناانصافی یا زیادتی کی خبر ان تک پہنچی انہوں نے اس کے خلاف فوری اور مؤثر کارروائی کی۔

ایک روایت ہے کہ ایک نیک بادشاہ کسی علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کی فوج ہمراہ تھی۔ ان دنوں بادشاہ فوج اور سول ہر محکمے کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ راستے میں سیبوں کا ایک باغ پڑا۔ سرخ سرخ پکے ہوئے سیب اشتہا کو دعوت دے رہے تھے۔ بادشاہ نے بے خودی میں آکر سیب توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر کچھ سوچ

کر ہاتھ کھینچ لیا۔ وزیر نے دریافت کیا۔ (دریافت کرنے والے دانش مند وزیر بھی ان دنوں بادشاہوں کے ہمراہ رہا کرتے تھے) "اے شاہِ عالم! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔" ارشاد عالی ہوا۔ "کہو۔" وزیر نے عرض کی "شاہ عالم نے سیب کے لئے ہاتھ جو بڑھایا تھا تو پھر توڑنے سے احتراز کیوں فرمایا؟" بادشاہ نے پورے جلال کے ساتھ کہا۔ "اے وزیر باتدبیر! تم پر واضح ہو کہ اگر کسی فوج کا سربراہ کسی باغ سے ایک سیب توڑے تو اس کی فوج اس باغ کے پھل تو کیا، پتوں کو بھی روند ڈالتی ہے۔"

ٹکا خان صاحب خود نیک آدمی تھے۔ سُنا ہے کہ شراب اور عورت ان کے کردار کی کمزوری میں شامل نہ تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ انہوں نے ایک عام حکم جاری کیا تھا کہ اگر فوج کے کسی فرد کے متعلق جنسی بے راہ روی کی شکایت موصول ہوئی تو اس کے خلاف نہ صرف سخت ترین کارروائی کی جائے گی بلکہ سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے مگر ٹکا خان صاحب تک رسائی کوئی آسان نہ تھی۔ عام انسان کے لئے شکایت کا ان تک پہنچانا جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف بھی تھا۔

ایچ آر ملک صاحب کی دونوں بیٹیاں لوکھی اور تیکھی شباب کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی خوبصورت بچیاں تھیں ۔ ایک صبح ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا کہ ملک صاحب کا فون آیا۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے اور اسی وقت آنا چاہتے تھے دس منٹ میں ہی وہ آگئے۔ مسز ملک دل کے عارضہ میں مبتلا تھیں اور تمام رات ان کی بچیوں کے کمرے کے باہر ٹہلتے ہوئے گزری تھی۔ گزشتہ شام دو کپتان وہاں گئے تھے اور چوکیدار سے پوچھا تھا۔ "کیا اسی گھر میں وہ دو لڑکیاں رہتی ہیں؟" مسز ملک شب بیداری کے باعث نڈھال ہو رہی تھیں ۔ یہ قصہ اس شخص کے گھرانے کا تھا جو حکومت پاکستان کا وفادار اور اعلیٰ عہدیدار تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کتنی باہمی

کے افراد پاکستان فوج کی وردی پہن کر ہماری فوج کو بدنام کرنے کے لئے ایسی حرکات کر رہے ہوں ۔ مگر ٹکا خان صاحب کے سخت احکامات کے باوجود ذاتی سطح پر اس نوعیت کی اطلاعات مل رہی تھیں ۔

ان دنوں ماحول اس قدر بوجھل بوجھل رہتا ۔ فضا میں ایسی گھٹن تھی کہ حواس کو بجا طور پر مجتمع رکھنا بھی بڑے حوصلے کی بات تھی ۔ ایک شام سب احباب جمع تھے ۔ جنرل نیازی صاحب بھی تشریف فرما تھے ۔ جنرل صاحب چودھری صاحب کے دوست اور میرے شوہر کی فوج کی ملازمت کے دنوں کے استاد تھے ۔ ہم سب ان کی بہت عزت کرتے تھے ۔ وہ مجھے سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک سادہ مزاج انسان لگے ۔ اپنے متعلق بہت انکسارانہ صاف گوئی سے کام لے کر فرمانے لگے ۔

" بھئی ہم تو اتفاقات کے زینے پر چڑھ کر اپنے موجودہ عہدے تک پہنچے ہیں ۔ یعنی ہر جنگ کے ساتھ عہدے کا اضافہ ہوتا گیا ۔ ورنہ علمی طور پر ہم "کے ۔ این ۔ او ۔ ڈبلیو ۔ کنو" اور " ٹی ۔ او ۔ این ۔ جی ۔ یو ۔ ای ۔ ٹنگو " کہنے والے ہیں ۔

ہمارے ہاں اعلیٰ ، بامحاورہ اور صحیح تلفظ میں انگریزی بولنا اعلیٰ تعلیم کا مسلّم ثبوت سمجھا جاتا ہے ۔ غلامی کی اس نشانی کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ آزادی کے تئیس سال نے انہیں ذرا بھی کمزور نہیں کیا) نیازی صاحب ہمارے ساتھ بڑے مشفقانہ طریقے سے ملتے اور میرے شوہر کو اپنا شاگرد ہونے کے ناطے سے بیٹے کی طرح سمجھتے ۔ وہ ان دنوں ٹائیگر نیازی کے نام سے موسوم کئے جاتے اور واقعی جب وہ وردی پہنتے تو تمغوں سے بھرا ہوا سینہ ان کے بہادرانہ کارناموں کا منہ بولتا گواہ بن جاتا ۔

کہنے کو تو حالات معمول پر آرہے تھے ۔ مگر ہر روز ہی کہیں نہ کہیں بم پھٹتے رہتے ۔ جونہی بم پھٹنے کی آواز آتی تو ہم چند لمحوں کے لئے ہراساں ہو جاتے ۔ مرد حضرات ٹیلیفونوں کی طرف بھاگتے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کہاں بم پھٹا ہے اور کیا نقصان ہوا ہے ۔ ایک روز

میں نے اپنے شوہر کے ایک کرنل دوست کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "یار! ہماری زندگی کا کیا بھروسہ ـ ؟ کہیں جاتے ہوئے کسی موڑ پر کسی شکل میں موت ہمیں مل سکتی ہے۔"

اور وہ کچھ غلط نہ کہہ رہے تھے ۔ ایک شام ہم سب انور مسعود صاحب کے ہاں گئے ۔ یہ سر سیّد احمد خان کے پوتے ہیں ۔ ان کا کاروبار وہاں تھا ۔ ڈھاکہ میں ہی ان کی سکونت بھی تھی ۔ واپسی پر ہمیں کچھ دیر ہو گئی ۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی ۔ ایک موڑ سے گزر کر تھوڑی دور ہی ہم گئے ہوں گے کہ دھاڑ سے بم پھٹنے کی آواز آئی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہیں کونے میں تخریب کار چھپے ہوئے تھے ۔ جونہی فوجی جیپ پر رات کو گشت لگانے والی پارٹی وہاں سے گزری انہوں نے اس پر بم پھینک دیا ۔ غالباً دو افراد جائے وقوع پر ہی شہید ہو گئے ۔

غالباً تخریب کاروں کی ٹریننگ بھی کچھ ایسے خطوط پر ہوئی تھی اور پھر وہ علاقے کے چپّہ چپّہ سے واقف تھے ۔ ہر گلی کوچے کا صحیح راستہ انہیں معلوم تھا ۔ علاقے کی تمام عمارات ان کی جانی پہچانی تھیں ۔ اس لئے ان کی سرگرمیوں کا ہر عمل اتنا اچھا اور جچا تُلا ہوتا کہ جس نشانے پر چاہتے ، وہیں نہایت کامیابی سے وار کرتے ۔

عبدالمنعم خان صاحب جو سابق گورنر تھے ان کا قتل بھی مکتی باہنی کے کامیاب ترین منصوبوں میں سے ایک تھا ۔ ابھی شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا کہ ان کے گھر کے باہر ایک سفید کار آ کر رکی ۔ کار سے دو نوجوان لڑکے باہر آئے ۔ ڈرائنگ روم میں منعم خان صاحب اپنے چند سیاسی رفقاء کے ساتھ محو گفتگو تھے ۔ وہ لڑکے سیدھے ان کے ڈرائنگ روم میں آئے ۔ یعنی ان کو ہر کمرے کا محل وقوع اور اس کا راستہ ، سب کچھ معلوم تھا ۔ انہیں کسی سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی ۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی ۔ تڑ تڑ تڑ تڑ ـــــ اور منعم خان صاحب خون میں لت پت نہا گئے ۔ ان کے رفقاء صوفوں کی آڑ میں پناہ گزیں ہوئے ۔

بندوق کی آواز سن کر ساتھ کے کمرے سے ان کا بیٹا جلدی سے آیا۔ ایک تخریب کار لڑکے نے دوسرے سے دریافت کیا — "کیا اسے بھی — ؟" اس نے جواب دیا۔ "نہ — درکار نہ —" یعنی اس کو مارنے کی ضرورت نہیں — اور دونوں اطمینان سے موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔ یہ سارا خونی ڈرامہ چند سیکنڈوں میں ختم ہو گیا۔

میرے شوہر کا دفتر ڈھاکہ شہر کے عین مرکز میں ایک بہت بڑی عمارت میں واقع تھا — اس پوری عمارت میں میرے شوہر واحد مغربی پاکستانی تھے۔ ورنہ باقی تمام سینکڑوں افراد بنگالی ہی تھے۔ میرے شوہر اکثر کہتے ۔"میری زندگی اس وقت تک ہے جب تک یہ لوگ چاہیں۔ ورنہ جب یہ چاہیں مجھے ختم کر سکتے ہیں —" میں کانپ جاتی اور دعائیں مانگنے لگتی ۔ "اے موت د حیات دینے والے تو ہی حافظ و ناصر ہے" جب تک میرے شوہر دفتر سے واپس نہ آجاتے۔ جسم وجان پر ایک کھچاؤ سا رہتا... اور دوسرے روز بے اطمینانی و بے سکونی کی اسی کیفیت سے پھر گزرنا پڑتا — شوہر کے باہر جانے کے بعد سورۃ یٰسین کی وہ آیت جن کا رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرتے ہوئے ورد کر رہے تھے۔ یعنی

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

(اور بنائی ہم نے ان کے آگے دیوار، ان کے پیچھے دیوار، پھر اوپر سے ڈھانک دیا، سو ان کو کچھ نہیں سوجھتا۔)

پڑھتی رہتی ——

مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک کرم فرما جواب بھی بہت بلند مرتبہ ہیں۔ جب چند روز کے لئے ڈھاکہ گئے۔ تو انہوں نے ایک مرتبہ ہمارے ہاں بیٹھ کر ہی یہ فرمایا تھا کہ "جو لوگ یہاں رہ کر بھی زندہ رہیں انہیں کوئی نہیں مار سکتا۔" سخت جانی ہائے

حیات تو دیکھئے کہ دوستوں کو بھی اس کی ڈھٹائی کھلنے لگی۔

یوں تو پرانے بنگالی دوستوں میں سے موسیٰ صاحب۔ رشید صاحب۔ بی، بی چودہری صاحب، سبھی بہت اچھے تھے۔ سب کے ساتھ میل ملاپ تھا۔ آنا جانا بھی رہتا۔ چھوٹی موٹی تقریبیں بھی سجائی جاتیں — مگر چور ان کے دل میں بھی ہوتا اور ہمارے اندر بھی ایسے اجنبی احساسات چھائے رہتے کہ ہم لوگ باہم بیٹھ کر بھی یک جا نہ ہو سکتے۔ بظاہر تو سب کچھ ہی ٹھیک ہوتا۔ وہ بھی سب اچھی طرح ملتے اور ہم بھی اسی طرح رہتے۔ مگر کوئی ایسی نہ دکھائی دینے والی دیوار درمیان میں حائل ہو چکی تھی۔ جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی، بس محسوس اس شدت سے ہوتی تھی کہ روح کی بالیدگی کو اپنے دباؤ سے کچل کر رکھ دے۔

ایک شام لغاری صاحب آئے اپنی بیگم کے ہمراہ — یہ براؤن بالوں کے لچھوں والی متناسب جسم کی خوبصورت خاتون مجھے پہلی نظر میں ہی اچھی لگیں۔ لغاری صاحب ایک وجیہہ شخصیت کے مالک مغربی پاکستان سے آنے والے پولیس افسر تھے — مجھے اور ثریا بھابھی کو بہت خوشی ہوئی کہ چلو کوئی اور خاتون بھی آگئیں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ بہت جلد واپس چلی جائیں گی۔ لغاری صاحب ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو پتہ چلے یا کوئی ان کی بیگم کو دیکھے — اور اس وقت ان کی دانشمندی کے سامنے مجھے اپنا ہر جگہ بھاگے پھرنا خاصا احمقانہ عمل لگا۔

مگر مسز لغاری بہت بہادر خاتون نکلیں۔ دوسرے روز جب میرے شوہر نے جیل کے معائنے کا پروگرام بنایا تو ہم تینوں خواتین نے جیل دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مسز لغاری سب سے پیش پیش تھیں۔ بلکہ وہ تو پھانسی لگنے والی جگہ بھی گئیں اور متعلقہ افراد سے پھانسی کے عمل کی پوری تفصیل باضابطہ طور پر سنی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جیل کی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ تمام بنیادی حقوق سے محروم

لوگوں کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی آئے یا کوئی جائے، کسی کی بھی حکومت ہو۔ ان کی دنیا کے شب و روز وہی رہیں گے۔

ایسٹ پاکستان رائفلز کا نام تبدیل کر کے اب ایسٹ پاکستان سول فورس رکھ دیا گیا تھا اور اس کے سربراہ جنرل جمشید تھے۔ یہ چودھری صاحب کے جاننے والے تھے اور مع اہل و عیال فیل خانے کے فلیگ سٹاف ہاؤس میں مقیم تھے۔ اس روز ہم سب ان کے ہاں گئے۔ اب ہم لوگ ہر جگہ اکٹھے ہی جاتے تھے۔

فیل خانے کا علاقہ تو آج سے اٹھارہ برس پہلے بھی اپنی نوعیت کا خاص علاقہ تھا۔ وہاں کے عام بنگلے بھی ایک خاص قسم کی شان کے حامل تھے اور آج تو ہماری منزل کمانڈر کا گھر تھا۔

باہر گیٹ سے ہی احساس ہونے لگتا تھا کہ کسی خاص جگہ جا رہے ہیں۔ کمانڈر، ای۔ پی۔ سی۔ ایف کا مکان نہ صرف اعلےٰ تعمیر کا مظہر تھا۔ بلکہ وہاں کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کا معیار بھی اتنا بلند تھا کہ ایک عام انسان تو گھستے ہوئے ہی ڈرے کہ مبادا اس کے وجود سے کوئی چیز گندی نہ ہو جائے۔

جنرل اور بیگم جمشید دونوں بہت ہی عمدہ انسان تھے۔ کچھ دیر باتیں کرنے سے مجھے احساس ہونے لگا کہ ان کی ڈھاکہ میں موجودگی ہمارے لئے ذہنی طور پر کتنی بڑی پناہ گاہ تھی۔ بیگم جمشید لاہور کی رہنے والی بڑی باوقار خاتون تھیں۔ ثریا بھابی تو انہیں پہلے سے جانتی تھیں۔ مگر مجھے بھی چند لمحات کی گفتگو نے ان کے قریب کر دیا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ای پی آر کی بغاوت سابقہ کمانڈر کی غلط پالیسیوں اور کمزوری کے باعث واقع ہوئی ہے —— دراصل جمشید صاحب بریگیڈئر کی حیثیت سے اسی فورس کی کمان پہلے بھی کر چکے تھے۔ جب کہ بیگم صاحبہ کے بقول ہر فرد خواہ کسی عہدے سے تعلق رکھتا ہو، پاکستان کا مکمل طور پر وفادار تھا۔ تو اس

تھوڑے عرصہ میں جب کہ دوسرے صاحب کی زیرِ کمان یہ فورس رہی کیسے اتنی بڑی بغاوت ہوگئی — وہ وثوق سے کہہ رہی تھیں کہ اب پھر جنرل جمشید حالات پر کافی حد تک قابو پا چکے ہیں - اور جلد ہی انشاء اللہ سب کچھ معمول پر آجائے گا۔

اس وقت ان کے ہاں ملازمین ای پی سی ایف کے بنگالی افراد ہی تھے — بیگم صاحبہ کا کہنا تھا کہ جنرل صاحب نے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔ لہٰذا سابقہ ای پی آر کے بہت سے ملازمین دوبارہ وفاداری کا حلف لے کر ای پی سی ایف میں شامل ہو رہے ہیں۔ وہ خود بھی گھر کے ملازمین کو احساس دلاتی رہتی تھیں کہ دیکھا کیا نتیجہ ہوا تمہاری بغاوت کا — ؟ اب معافی مانگ کر پاکستان کے وفادار بن کر چین سے رہو اور ہاں آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا — ! ان کا خیال تھا کہ ان کی تنبیہہ خاصی مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔

جنرل جمشید ضلع جہلم کے قصبہ ڈومیلی کے رہنے والے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم سے لے کر ہر جنگ میں سرگرم عمل رہے تھے۔ سپاہیانہ تجربہ ان کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ گو ان سے براہِ راست میری گفتگو نہ ہوئی۔ مگر میں قریب ہی بیٹھی ہوئی ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ میرے وطن اور میرے شہر کے ایسے فرد تھے۔ جن پر اس سمے وہاں بیٹھی ہوئی میں دل ہی دل میں فخر کر رہی تھی۔ ان کے کردار میں میرے علاقے کا خصوصی کردار جو ان جیسے تجربہ کار عہدے دار کا خاصا ہے۔ جھلک رہا تھا مگر اُس چٹان جیسے اعتماد میں ایک ایسے انکسار و حیا کی آمیزش تھی۔ ایسی سادگی اور کشادہ دلی کا رنگ تھا جو میرے جہلم کی خصوصیت ہے۔

جب بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جنرل جمشید نہ صرف ای پی سی ایف کے سربراہ تھے بلکہ ڈھاکہ کی پولیس بھی ان ہی کے ماتحت تھی۔ تو مجھے ذرا تعجب نہ ہوا کہ ان دنوں تو ہر محکمہ ہی ان لوگوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ مغربی پاکستان سے سویلینز کو بلا کر

یہاں تعیناتی کرنا تو محض خانہ پُری کے بموجب تھا۔ یہ سول انتظامیہ کے افسران دفتروں میں باقاعدگی سے جاتے۔ کچھ کام بھی فائلوں پر کرتے ہی ہوں گے۔ مگر یہ حقیقت اظہر من الشمس تھی کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ ان کی حیثیت محض آتشدان کے ان لکڑی کے کندوں کی سی تھی جنہیں آگ میں جھونکے جانے پر اختیار نہ ہو۔ ہر قسم کے اقتدار کی مکمل باگ ڈور مسلح قوتوں کے پاس تھی۔

بہر حال جنرل جمشید رہبیگم صاحبہ کا دم بہت غنیمت تھا۔ ان کی مہربانی سے ای پی سی ایف کے خصوصی سینما ہال میں پکچر لگتی تو کبھی کبھار ہمیں بھی مدعو کر لیا جاتا اور ہمارے لئے تین گھنٹے کا اپنے ماحول سے فرار اتنی بڑی نعمت تھی جس کا اندازہ وہ لوگ نہ لگا سکیں گے جنہوں نے وہ گھٹن دیکھی ہی نہیں ——

سنا ہے کہ مئی میں تخریب کاروں نے شہر میں جگہ جگہ یہ پوسٹر لگا دیئے تھے۔ "ڈھاکہ خالی کر دیا جائے اور کوئی سرکاری ملازم دفتر نہ جائے۔ کیوں کہ ہم لوگ ڈھاکہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں گے اور موجودہ سرکار کے ساتھ تعاون کرنے والوں کو سزائے موت دیں گے۔" یہ حربہ خاصا کارگر ثابت ہوا اور بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر دیہی علاقوں میں چلے گئے۔

جولائی میں اکثر لوگ مکتی باہنی کی دھمکیوں کو گیدڑ بھبکی سمجھ چکے تھے اور ڈھاکہ کی زندگی خاصی نارمل ہو چکی تھی۔ مگر جولائی کے تیسرے ہفتے میں پھر یہی پوسٹر لگنے لگے۔ عوام نہ جانے کیوں ہر بات پر ہراساں ہو جاتے تھے۔ شاید گزشتہ واقعاتِ قتل و خون نے سب کے حوصلے بالکل پست کر دیئے تھے۔ پبلک کا تو کہنا ہی کیا۔ ہمارے کئی افسران سخت خائف تھے۔ بار بار میرے شوہر کو ٹیلیفون کرتے کہ "بھئی کچھ تو بتاؤ کیا ہونے والا ہے؟ ——" اور پھر تمام تسلیوں کو طفل تسلیاں گردان کر مایوسی سے کہتے ——" ہاں میاں! ۔ تم چھپاتے ہو ——"

اب کے دھمکی کچھ یوں تھی کہ "اٹھائیس جولائی تک ڈھاکہ خالی کر کے گاؤں میں چلے جاؤ۔ کیوں کہ ہم ڈھاکہ میں قتلِ عام کرنے والے ہیں۔ ان بنگالیوں سے بھی کوئی رعایت نہ برتی جائے گی جو ہماری وارننگ کو مذاق پر مبنی سمجھ رہے ہیں۔" اس کا عوام پر کچھ اس طرح اثر ہوا کہ بعض لوگوں نے تو اسے واقعی سنجیدہ اور صحیح دھمکی سمجھ کر اپنے اہل و عیال کو گاؤں میں بھیج دیا۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ حالات" پاکستان کی فوج کے قابو میں ہیں۔ لہٰذا قتل و غارت ممکن نہیں۔ اور بال بچوں کو ڈھاکہ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی کش مکش کے عالم میں تھے۔ بے یقینی اور غیر اطمینانی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پر اسرار قسم کے خطوط بمعہ کفن (چھوٹے سے لٹھے کے ٹکڑے کے ساتھ) بہت بڑھ چکے تھے۔ یہ خطوط مقامی بنگالی سرکاری ملازمین کو ہی بھیجے جا رہے تھے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جس روز جس کو بھی یہ خط ملتا اسے چند روز تک تو اپنے گرد موت منڈلاتی نظر آتی۔ — اکثر ایسی خبریں بھی ملتی رہتیں کہ فلاں فلاں تعاون کرنے والے کو شہید کر دیا گیا۔ اور اس طرح کی خبریں ان مقامی بنگالیوں کے دلوں میں —— جو پاکستان کے ساتھ وفاداری کر رہے تھے —— خوف کو دس گنا بڑھا دیتیں۔

اتوار کا روز تھا۔ غالباً اگست کی پہلی تاریخ تھی۔ علی الصبح مولوی فرید احمد صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ وہ آنا چاہ رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے نام سے پاکستان میں کون روشناس نہ ہوگا۔ وہ چٹاگانگ کے علاقے سے وابستہ، مشرقی پاکستان کے ایک قابلِ قدر سیاستدان تھے۔ قومی اسمبلی میں اپنی موشگافیوں کے باعث مغربی پاکستان میں بھی ایک جانی پہچانی ہستی تھے۔

ابھی میرے شوہر غسل کر کے باہر آئے ہی تھے کہ ہمارا اردلی حمید بھاگتا ہوا آیا۔ کہنے لگا "صاحب! ایک مولوی صاحب ملنے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ سٹین گن لئے ہوئے ایک آدمی ہے۔ گارڈ کا حوالدار انہیں سٹین گن اندر لانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ اس کا

کہنا ہے کہ گن گارڈ روم میں رکھ جایئے۔ اور واپسی پر لے جایئے گا۔ مگر وہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب کو اطلاع دو۔" "مگر صاحب! دیکھئے نا انہیں سٹین گن لانے کی کیسے اجازت دی جا سکتی ہے؟" یہ حمید نے اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ میرے شوہر کہنے لگے۔ "نہیں، انہیں گن لے کر آنے کی اجازت دو۔ اور ڈرائینگ روم میں لا کر بٹھاؤ۔"

میرے شوہر جلدی سے نیچے گئے تاکہ اپنے مہمان کا خیر مقدم کریں مگر مجھے بھی یہ بات بہت کھٹکی کہ آخر یہ حضرت سٹین گن کے ساتھ کیوں آنا چاہتے ہیں۔

ان دنوں وہاں کے حالات اس قدر مخدوش اور ہنگامی تھے کہ ذرا سی بات سے بے وجہ ہی دل بیٹھنے لگتا تھا۔ چند لمحوں میں ہزاروں ہی وسوسے ذہن میں چکر لگانے لگے۔

ابھی میں بچوں کو پڑھانے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ ملازم نے اطلاع دی کہ "صاحب نیچے ڈرائینگ روم میں بلا رہے ہیں۔ ایک بیگم صاحبہ ملنے کے لئے آئی ہیں۔" یہ خاتون ایک سینیئر افسر کی بہن تھیں۔ ابھی تک نا کتخدا ہونے کے باعث بہت حساس تھیں لہٰذا بادلِ نخواستہ بچے کی پڑھائی کے پروگرام کو بالائے طاق رکھا اور نیچے چل دی۔

ڈرائینگ روم میں خاصی رونق تھی۔ ایک صوفے پر مولوی فرید احمد صاحب گہرے نیلے رنگ کی سرخ بارڈر والی لنگی، سفید بنگالی طرز کا کرتہ اور سفید ٹوپی پہنے اور ایک موٹی سی چھڑی کا ہینڈل ہاتھ میں پکڑے بلند آواز میں مصروفِ گفتگو تھے۔ ان کی باتوں کی رفتار سے ظاہر تھا کہ وہ سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں اور محض بولنے پر مصر ہیں۔ دوسری طرف ان کا بھتیجا سٹین گن اس طرح صوفے کے نزدیک رکھے کہ اس کا ایک ہاتھ گن کے اوپر تھا بیٹھا تھا۔ دو نوجوان افسران اکبر علی اور خلیل بھی موجود تھے۔ اور میری مہمان خاتون سائیڈ کے سرخ صوفہ پر تشریف فرما تھیں۔

علیک سلیک کے بعد مولوی فرید احمد صاحب نے اپنا سلسلہ گفتگو جاری کیا ——

انہیں سخت شکوہ تھا کہ مسلح قوتوں کے افراد ان کے مرتبہ کے قومی لیڈر کا حسب مراتب احترام نہیں کرتے (حالانکہ ان کا دعویٰ تھا کہ گولیوں سمیت یہ سٹین گن انہیں فوجی حکام نے دے رکھی تھی جسے وہ ہر جگہ لے جانے کے مجاز تھے)

مولوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر اس روزان کی دلچسپ گفتگو میں نے حرف بہ حرف اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔ اسی ڈائری کے صفحات (بغیر کچھ اضافہ کیے) تحریر کر رہی ہوں ——

مولوی صاحب کو خدا مغفرت نصیب کرے۔ بہت شاندار شخصیت کے مالک تھے اور اس حقیقت سے باخبر بھی تھے — ان کی ہر بات میں خودستائشی کا پہلو کبھی مخفی اور کبھی عیاں موجود تھا۔

"دیکھئے نا صاحب! (چونکہ میں ان کے سامنے بیٹھی تھی اور میرے شوہر نے انہیں بتایا تھا کہ میں ایڈووکیٹ بھی ہوں لہٰذا وہ مجھ سے ہی مخاطب تھے) مجھے صدر صاحب نے بیرونِ ممالک، پاکستان کے نظریے کی وضاحت کے لئے پاکستان کا نمائندہ بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں جب سٹیمر میں سوار تھا۔ وہاں مسلح قوتوں کے ایک جونیئر افسر بھی سوار تھے۔ مجھ سے اس طرح سرسری طور پر ملے۔ جیسے میں بھی ایک عام آدمی ہوں اور پھر جب فیری پر پہنچے تو ان صاحب نے پہلے اپنی جیپ بھجوائی اور میں سب سے آخر میں فیری پار کر سکا۔" وہ شاکی تھے کہ ان کے مرتبے کو فوراً کیوں نہیں پہچان لیا جاتا ——

مولوی صاحب بہت قصّے سناتے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں تک سچے تھے۔ ان کا کہنا تھا — "جب ملیشیا قوت آئی تھی تو اس کے افراد راہ چلتے راہگیروں کو لوٹ لیتے تھے — اگر کوئی روپیہ نہ دے تو اسے وہیں مار دیا جاتا تھا۔ عورتوں کی سرراہ عصمت لُوٹ لی جاتی اور گھروں میں گھس کر بھی یہی تماشا دہرایا جاتا۔ سخت کرفیو کے وقت غنڈے

گھروں میں گھس جاتے اور لوٹ مار اور بدکرداری کے خوب مظاہرے کرتے" وہ حکام کو بھی اس بے راہ روی میں ملوّث سمجھتے۔ ورنہ بقول ان کے "۔ غنڈوں کو ایسی جرأت کیسے ہو سکتی تھی ــ" میں نے انہیں خاص مثالیں دینے کے لئے کہا۔ تو بولے "سنگرام کا ایڈیٹر جو وکیل بھی تھا، مسلم لیگی اور پاکستان کا وفادار تھا۔ وہ میرے گھر سے شام سات بجے نکلا۔ کرفیو نو بجے شروع ہوتا تھا۔ اتفاق سے راستے میں اس کی کار خراب ہوگئی ــ ایک جیپ پاس آکر رکی۔ جس میں تین ملیشیا اور ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص تھا۔ انہوں نے زبردستی سنگرام کے ایڈیٹر کو جیپ میں بٹھالیا۔ اس کی بہت منّت سماجت پر وہ اسے اس کے گھر تک لائے۔ پھر سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص نے کہا کہ " تمہاری جاں بخشی کی ہے اب اس کا نقد معاوضہ دو۔ اور اس کے علاوہ بتاؤ کہ اس محلہ میں کون کون مالدار شخص ہے۔"

مولوی فرید احمد صاحب کا کہنا یہ تھا کہ " صاحب اقتدار حضرات کہتے تو یہ ہیں کہ ہمیں عوام کا مکمل تعاون چاہیئے۔ لیکن اگر انہیں بدعنوانی کی اطلاع دی جائے تو اطلاع دینے والا خود پھنس جاتا ہے اور اکثر اوقات اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اسی لئے لوگ خبر دیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

میں نے انہیں پھر مثال دینے کے لئے کہا تو بولے ــ" ایک صاحب اقتدار افسر نے ایک چھوٹی سی فرم کے مالک کو کہلوا کر بھیجا کہ دو ہزار روپے ادا کرو۔ ورنہ تمہارا نام مکتی باہنی کی فہرست میں رکھ کر تمہیں ختم کر دیا جائے گا ــ" اس بات کی اطلاع میں نے معہ ثبوت متعلقہ افسروں کو دی۔ وہ بولے کہ عرضی کی صورت میں تحریراً شکایت بھیجو، ہم کارروائی کریں گے۔ مگر جب ایک شخص نے یہی بات لکھ کر دی تو دوسرے روز مسلح قوتوں کے افراد اس شخص کو ہمراہ لے گئے اور آج تک اس کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔"

دراصل اب مخبر صرف اس قسم کے لوگ رہ گئے ہیں۔ پہلے تو وہ لوگ جو حالات سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مچا رہے ہیں اگر کوئی ان سے ٹکرا ئے تو وہ اس کا نام مقتدر حکام کو دے دیتے ہیں اور پھر صاحبانِ اقتدار بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس کا قصہ تمام کر دیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جن کا گٹھ جوڑ رشوت خور افسروں سے ہے۔ وہ لوگوں سے روپیہ طلب کرتے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم نہ دستیاب ہو سکے تو اس شخص کا نام مکتی باہنی میں شامل کر کے اسے اس کے گھر سے لے جایا جاتا ہے۔ پھر اس شخص کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں گیا ۔

میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب چونکہ بنگالی ہیں لہٰذا ہماری مسلح قوتوں میں نقص نکال رہے ہیں۔ ورنہ حالات اس نہج تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر شام کو مولانا خیری صاحب جو ایک بہاری تھے کسی مقامی سکول میں ٹیچر تھے تشریف لائے اور انہوں نے بھی اس صورتِ حالات کی تصدیق کی تو میں دل مسوس کر رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس رویے کے ساتھ مشرقی پاکستان کے حالات کیسے سدھر پائیں گے۔

دن بدن مقامی لوگوں کے دلوں میں نفرت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی لوگ کہتے تھے ۔ "پہلے تو سنتے ہی تھے کہ پنجابی ظالم ہوتے ہیں اب آنکھ سے دیکھ لیا"۔ مغربی پاکستان سے جانے والی ہر قوت کو "پنجابی" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ورنہ میری تو سمجھ سے یہ چیز بالاتر تھی کہ سادہ لوح پنجابی اس قدر بدنام کیوں ہو رہے تھے ۔

حالانکہ مغربی پاکستان سے جانے والی پولیس کے بیشتر افراد پنجابی تھے اور مجھے معلوم ہے کہ یہ کس بہادری سے مشرقی پاکستان کے پلوں کی حفاظت کر رہے تھے دُور افتادہ ذیلی علاقوں کے ہر پُل پر محض دو سپاہی تعینات کر دیئے جاتے۔ ان حالات میں جب وردی پہن کر باہر نکلنا موت کو آواز دینے کے مترادف تھا ۔ یہ

سادہ لوح افراد ہر نتیجے سے بے نیاز "موت کا ایک دن معیّن ہے" پر اعتقاد رکھے ہوئے، بے خوف وخطر، ہر پُل پر دو دو کھڑے اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہ عزت و آن پر کٹ مرنے والے۔ نہ جانے کیوں بدنام ہو رہے تھے؟ برسات و دلدل میں پڑے ہوئے غریب الوطنی کی صعوبتیں برداشت کرنے والے ان افراد کے ساتھ غیر انسانی کردار منسوب ہوتا جا رہا تھا۔

ذیلی علاقوں میں کھلے پُلوں پر، وسیع دریاؤں کے کنارے، ان لوگوں کا ہر پتّہ اور ہر پتھر دشمن تھا۔ اس دلدلوں اور پانیوں والی سرزمین پر جوٹ ماتھ اور زہریلے بے شمار کیڑوں کی یلغار کا شکار بنے ہوئے ان مسلح افراد کو وہاں کا ہر ذرّہ حریفانہ نظر سے دیکھتا۔ ان لوگوں کو کھانا تو سرکاری طور پر ملتا تھا۔ مگر ان کی اور بھی ضروریات تو ہوتی ہیں نا۔ اور ان تنہا جگہوں پر۔ اس معاندانہ ماحول میں ان کے ہاتھ میں مہلک ہتھیار تھے، جو ان کے واحد ساتھی اور دوست تھے اور وہی انہیں زندگی گزارنے کا راستہ دکھا رہے تھے۔!!

ہماری شام کی محفلیں پورے دن کا ماحاصل بنتی جا رہی تھیں۔ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا۔ ہر ممکن ذرائع سے وصول کردہ خبریں جمع کر کے ہم لوگ یہ سوچتے رہتے کہ اب ہوگا کیا؟ — "کیا ہوگا۔" ہمارے چہروں پر لکھا جا چکا تھا۔ یوں تو تقریبیں بھی منعقد ہوتیں اور ہم لوگ ان میں شرکت بھی کرتے۔ مگر "اب کیا ہوگا۔" کی تحریر کسی پل محو نہ ہوتی۔

نیپال کا قومی دن تھا اور نیپالی کونسلر نے ڈھاکہ کے انٹرکانٹی نینٹل میں استقبالیہ دے رکھا تھا۔ ہمارے وہ لوگ جو پینے پلانے کے مشتاق ہوتے ہیں وہ ان دعوتوں کا خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ دو گھنٹے کی مے نوشی کے بعد اچانک گل آدم جی نے ہمیں کھانے کے لئے وہیں رکنے پر اصرار کیا۔ ہم لوگ ان کے ساتھ اوپر "گولڈن کی کلب"

جواں دولت مند صنعت کاروں کے لئے مخصوص تھا، میں آ گئے۔ مے نوشی کا دُوسرا دور شروع ہوا۔ سوائے میرے شوہر اور چودھری صاحب کے، جو خشک زاہد بنے ہوئے ماحول سے جُدا ہی لگ رہے تھے۔ سبھی حضرات ترنگ میں تھے۔ خواتین میں صرف مَیں اور ثریا بھابی تھیں۔ وہ ماحول ہم جیسی خواتین کے لئے کچھ ساز گار بھی نہ تھا۔ گل آدم جی کو بحیثیت میزبان اس بات کا احساس ہوا تو وہ ہم دونوں سے آ کر محوِ گفتگو ہو گئے۔ اور اس روز پہلی مرتبہ مجھے تجارت اور صنعت سے منسلک حضرات کی دُور اندیشانہ بصیرت کا احساس ہوا۔

وہ بتا رہے تھے کہ ۔۔ "ایوب خان صاحب کے زمانے میں مجیب الرحمٰن صاحب کو جیل سے رہا کیا گیا تو اس وقت جب مجیب الرحمٰن جیل سے باہر نکل رہے تھے تو ان کا جس والہانہ جوش و خروش سے استقبال کیا گیا۔ میری آنکھوں نے اسی وقت پہچان لیا کہ آئندہ اقتدار کی باگ ڈور کا مالک یہی شخص ہو گا۔ میں بھی آئندہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے وہاں موجود تھا۔ میں ان کے ساتھ ہی لاہور گیا اور فلیٹیز ہوٹل میں ان کے قریب کے کمرے میں مقیم ہو گیا۔ میں نے انہیں فون کیا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ خود میرے کمرے میں آ گئے، اور بعینہٖ یہی میں چاہتا تھا کہ نہ صرف میرے مجیب الرحمٰن سے تعلقات ہوں بلکہ یہ کہ لوگوں کو بھی معلوم ہو کہ مشرقی پاکستان کے ہونے والے سربراہ سے میری دوستی ہے۔" میں ان کی دانشمندی کی قائل ہو گئی۔ یہ صاحبِ ثروت حضرات مستقبل میں کتنی دُور کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ان دنوں بھی یہ صاحبانِ عقل و بصیرت ہوا کے رُخ کا اندازہ لگا کر ہی اپنے کاروباری منصوبے ترتیب دے رہے ہوں گے۔

چین کے قونصل خانے کی ایک تقریب میں مجھے اپنی پرانی دوست لیلےٰ ملی ۔۔ شمس النہار ۔۔ جس کا ڈاک نام لیلےٰ تھا۔ میرے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی میں ۱۹۵۸ء

میں لاء کالج میں زیر تعلیم تھی۔ روزانہ ملاقات ہوتی۔ مگر اس روز جب میں گرم جوشی سے اس کی طرف لپکی تو اس کے چہرے پر ایسی اجنبی سی غیریت کھنڈ گئی کہ میں خفیف ہو کر رہ گئی۔ ہار ماننے والی تو میں بھی نہ تھی۔ میں نے اس کے شوہر کے ساتھ بھی زبردستی ہی خود کو متعارف کروایا اور اسے گفتگو پر مجبور کر ہی لیا۔

اب لیلےٰ ڈھاکہ کی ایک کامیاب وکیل اور اس کا شوہر ایک کامیاب جرنلسٹ تھا۔ مگر لیلےٰ کے بقول "اب تو ہر کام ٹھپ ہی پڑا ہے۔" میں نے اس سے قریب ہونے کے لئے مذاق کی آڑ لی — "ارے لیلےٰ! سنا ہے تمہاری تو وکالت خوب چلتی ہے، کتنا کما لیتی ہو۔؟"

"خاک اور دھول" لیلےٰ جل کر بولی:" عدالتیں تو بند پڑی ہیں۔ کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا۔ نہ میرا اور نہ میرے شوہر کا۔" اس کے چہرے کی سختی نے مجھے اور کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے پرانی دوستی کا سہارا ایک مرتبہ پھر لیا۔ "اتنی مدت کے بعد تمہیں مل کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے لیلےٰ! آؤ کسی روز میرے گھر۔ ممکن ہے، میں تمہارے کسی مسئلے کے حل میں مددگار ثابت ہو سکوں۔" وہ خاموش رہی۔ سختی سے منہ کو بھینچے ہوئے، عینک کے پیچھے سے دو موٹی موٹی آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ میں ان حقارت اور غصے بھری خاموش نظروں کی تاب نہ لا کر جلدی سے بولی۔ "اگر یہ ممکن نہیں لیلیٰ تو مجھے اپنا ایڈریس بتا دو، میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔" وہ بدستور مجھے خاموشی سے دیکھے گئی۔ حالانکہ یہ تو اکثر میرے ہاں عظیم پورہ کے ننھے سے فلیٹ میں آیا کرتی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی خاموش نظروں نے بتا دیا ———

ہم جو کبھی ایک تھے۔ اب ہمارے جذبات کے دھارے کبھی ایک نہ ہو سکیں گے۔ ہم نفرت اور غصے کی آگ میں اسی طرح جلتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی اور یہ یک جہتی جو خون کے دریا کو الانگ کر ہم نے لی تھی اس کے

پر نچے اڑجائیں گے — ہم اپنے قومی المیہ کے قریب کس تیزی سے جا رہے تھے۔

حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ ہم مغربی پاکستانی ملازم کو بازار بھیجتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں راستے میں ہی لقمۂ اجل نہ بن جائے۔ ہمارے خانساماں ادھیڑ عمر کے ایک بہاری شخص تھے۔ کھانا تو واجبی سا پکاتے مگر سنس مکھ ہونے کی وجہ سے یہ معمر شخص ہم سب کو پسند تھے۔ کثیرالاولاد تھے۔ بیوی بچوں کے لئے اکثر پریشان رہتے۔ جب بھی گھر ملنے کے لئے جاتے میں ڈرتی ہی رہتی۔ لیکن میرے اصرار کے باوجود وہ کمشنر ہاؤس کے کوارٹروں میں منتقل ہونے پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ یہ ہندو پاڑہ میں ایک تیس روپے ماہوار کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ہندو پاڑہ کے تمام مالکانِ مکانات تو بھارت فرار ہو چکے تھے۔ پورے محلے کے مکانات پر خانساماں کے بقول ایک میاں صاحب کا قبضہ تھا اور انہوں نے مکانات کرائے پر بھی اٹھا دیئے تھے۔ خانساماں کے نزدیک اتنے کم کرائے پر ڈھاکہ میں اور کہاں مکان ملے گا؟ لہٰذا وہ کسی قیمت پر ہندو پاڑہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

یوں تو مغربی پاکستان سے سول ملازمین مشرقی پاکستان میں خاصی تعداد میں تبدیل ہو کر آ رہے تھے مگر جس روز ڈاکٹر مجتبےٰ احسن ڈی۔آئی۔جی پولیس سپیشل برانچ بن کر آئے مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کے ساتھ ہی افسوس بھی کہ آتشدان میں جھونکے جانے والے کندوں میں ایک اور دوست کا اضافہ ہو گیا۔ مگر ان کی موجودگی ہماری قوتِ ارادی و حوصلہ میں ایک طرح کی معاون ثابت ہوئی۔

ثریا بھابی نے بچوں کے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا کہ بچوں کی پڑھائی انہیں اس سے زیادہ قیام کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ان کے جانے کے تصوّر نے ہی مجھے بہت اداس کر دیا۔ ان کا ساتھ میرے لئے بہت بڑی نعمت اور اخلاقی سہارا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد پورا دن بہت بوجھل بوجھل گزرا۔ ان کے ساتھ بچوں کی رونق

بھی کم ہو گئی تھی۔ پورے گھر پر افسردگی سی چھائی رہی۔

دوسرے دن گھر کے صبح کے معمول سے فارغ ہو کر میں سامنے کے برآمدے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ سیڑھیوں پر سے کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو مسز حسن اور حسن بھائی چلے آ رہے ہیں۔ جیبیہ بھابی بہت ناگواری کے تاثرات چہرے پر لئے ہوئے تھیں۔ ان کے ذہن پر ڈھاکہ آنے کا بوجھ نیا نیا صاف ظاہر تھا۔ میں نے وہیں سے خوشی کا نعرہ لگایا اور جا کر ان سے اس طرح لپٹی کہ اگر میری گرفت ڈھیلی ہوتی تو کہیں یہ کراچی ہی نہ واپس چلی جائیں۔

جیبیہ بھابی اور ہم سندھ کے ضلع تھرپارکر میں اکٹھے دن گزار چکے تھے۔ اتنی دوستی تھی کہ ہر جگہ اکٹھے جاتے۔ ریگزاروں میں باہم صحرانوردی کی تھی۔ ہر خوشی و غم میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ان کا وہاں سے تبادلہ ہوا اور وہ جانے لگیں تو ہم دونوں خوب روئی تھیں اور دعا کی تھی کہ خدا ہمیں دوبارہ یکجا پوسٹ کرے۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ مگر ہم نے یہ تو نہ چاہا تھا کہ ان حالات میں یکجا ہوں۔ بہرحال جیبیہ کے آنے سے ایک مرتبہ پھر زندگی میں رنگ بھر گیا۔ وہ دن بھر چٹکلے چھوڑتیں اور ماحول کی ہولناکی کو چمن زار بناتی رہتیں۔

○

دل میں آجاتے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں'

۱۴ اگست جوں جوں قریب آرہی تھی افواہوں کی تعداد میں شدت سے اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ افواہ شدید سے شدید تر ہوتی گئی کہ ۱۴ اگست کو تخریب کار ڈھاکہ پر زبردست حملہ کرنے والے ہیں۔ ہر چیز تہہ و بالا ہو جائے گی اور ۱۴ اگست کو پاکستانی نہیں بلکہ بنگلہ دیش کا پرچم لہرائے گا۔ اکثر لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ بلکہ کچھ مغربی پاکستان سے آنے والے سرکاری ملازمین ڈیوٹیاں بنا کر اسلام آباد چلے گئے۔ میں نے سنا کہ شہر میں محلّے کے محلّے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے بھی مالی وغیرہ بنگالی ملازمین چھٹی پر چلے گئے۔

اور پھر ۱۲ اگست کو تخریب کاروں کی ایک تخریبی کارروائی کامیاب ہو گئی۔ جس سے عوام کو ان کے دعووں پر کچھ یقین آنے لگا۔ اس شام چھ بجے کے قریب ہم اپنے

گھر کے اندر کی سڑک پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس زور سے بم پھٹنے کی آواز آئی، کہ کلیجہ دہل گیا۔ چند منٹوں کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں بم پھٹا تھا۔ کسی تخریب کار نے غسل خانے میں ٹائم بم رکھ دیا تھا جو اتنا بڑا تھا کہ کسی ہوٹل کے ملازم کے تعاون کے بغیر وہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس ضمن میں ایک ملازم کو تو اسی وقت شبہ کی بناء پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس عمارت کو بم سے نقصان تو پہنچا ہی تھا۔ جانیں بھی تلف ہوئی تھیں۔ ایک جرمن خاتون بہت زیادہ زخمی ہوئی۔ چونکہ اس ہوٹل میں زیادہ تر غیر ملکی باشندے رہ رہے تھے۔ اس لئے غیر ملکیوں پر بھی یہ ثابت ہو گیا کہ حالات، قوت کے استعمال کے باوجود کسی طور پر قابو میں نہیں آ رہے اور غیر ملکیوں کے سامنے ہماری ساکھ اور کم ہو گئی تھی۔

۱۴ اگست کو یوم آزادی پر میرے شوہر محفل مشاعرہ بھی منعقد کرنا چاہتے تھے۔ چند روز پیشتر اجلال حیدر زیدی، ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان آئے تھے انہوں نے ریڈیو پاکستان کی طرف سے مغربی پاکستان سے چار شعراء کو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ سیّد ضمیر حسین جعفری اس سلسلے کے پہلے شاعر تھے۔ جو بارہ اگست کو ڈھاکہ پہنچے۔

۱۳ اگست کو بارہ بجے دوپہر کے قریب ضمیر بھائی ہمارے ہاں آئے۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی شعر و شاعری کی محفل جمی اور چار بجے کے قریب میجر سالک انہیں اپنے ساتھ چھاؤنی لے گئے۔ ضمیر صاحب ان ہی کے ہاں قیام پذیر تھے۔

شام کو شمس الضحیٰ صاحب جو حکومت پاکستان کے مرکزی وزیر زراعت رہ چکے تھے، کے ہاں کھانا تھا۔ انہوں نے کافی لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا مگر تخریب کاروں نے ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ بہت سے لوگ دعوت پر نہ پہنچ سکے۔

کھانے کے بعد ہم مارا مار خورشید صاحب کے ہاں پہنچے، ان کے ہاں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ خورشید صاحب انصارز کے ڈائرکٹر جنرل رہ چکے تھے۔ بہت جی دار انسان

تھے۔ ان حالات میں بھی ڈر ان کے قریب نہیں پھٹک رہا تھا۔ مشاعرے کا ان دنوں اس علاقے میں اہتمام کرنا ایسے ہی جیدار وں کا کام ہو سکتا تھا۔ گو گورنمنٹ کی طرف سے کچھ مالی امداد کی گئی تھی۔ مگر پھر بھی جب ہم پہنچے تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ یوں تو اس مشاعرے کی صدارت ایم۔ اے کے چودھری صاحب نے کرنی تھی۔ مگر لاہور سے اچانک ان کے بڑے بھائی کے انتقال کی خبر آئی اور انہیں فوری طور پر وہاں جانا پڑا۔ اس لئے مشاعرے کی صدارت سید ضمیر حسین جعفری صاحب کو سونپی گئی تھی۔

فرشی مشاعرہ تھا۔ سامنے شعراء کی نشستیں تھیں اور ان کے برابر ہی سامعین قریب قریب بیٹھے تھے۔ ہم لوگ بھی وہیں ایک طرف بیٹھ گئے۔ شعراء میں ضمیر بھائی کے قریب نوابزادہ نصراللہ خان صاحب بھی بیٹھے تھے۔ ان دنوں اکثر مغربی پاکستان سے کچھ سیاستدان وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے جایا کرتے تھے۔ غالباً نواب صاحب کی ڈھاکہ میں آمد بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔

تسکین تمتائی اپنی نظم "بنگال آشوب" سنا رہے تھے۔ یہ نظم میں پہلے بھی اُن سے سن چکی تھی۔ اتنی متاثر کرنے والی نظم تھی کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ مقامی شعراء کے علاوہ نواب نصراللہ صاحب اور میرے شوہر نے بھی اپنا کلام سنایا۔

لوگ اشعار بھی سُن رہے تھے اور داد بھی دے رہے تھے۔ مگر ایک دن قبل ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کی تباہی نے سب کو سہمایا ہوا تھا۔ جس علاقے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے، یہ کوئی ایسا محفوظ علاقہ نہ تھا۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ جیبہ بھابی آہستہ آہستہ بولے جا رہی تھیں: "بھئی جواب نہیں ہے ہم لوگوں کا بھی — ! دیوانے ہیں پورے — اب دیکھو — کیا یہ حالات مشاعرہ بپا کرنے کے ہیں — ؟؟ — یہ تمہارے شوہر جہاں جاتے ہیں نا — مشاعرے کی شاخ ضرور ساتھ لیتے جاتے ہیں۔"

اور مجھے بار بار احساس دلا رہی تھیں کہ حالات مشاعرے کے لئے انتہائی ناساز گار ہیں۔ اچھی طرح دل جمعی سے لطف بھی نہ لینے دیا۔ مشاعرے کے اختتام پر گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا کہ چلو بھئی آج کا دن بھی خیریت سے گزر گیا۔

۱۴ر اگست کو یوم آزادی تھا۔ اس قومی دن کو منانے کے لئے تمام پروگرام مرتب ہو چکے تھے۔ میرا دل صبح سے ڈر رہا تھا کہ خدا خیر کرے۔ خدا کے حضور بار بار گڑگڑاتی تھی کہ آج کا دن بھی وہ اپنی رحمت کے ساتھ امن و امان سے گزار دے۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے سٹیڈیم میں آج کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس تقریب کو بہت اہمیت دی جا رہی تھی۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ اس تقریب کے ذریعے دُنیا پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ حالات بالکل معمول پر ہیں۔ تمام سفارت خانوں کے اہل کار اور دیگر غیر ملکی تمام اہم ہستیاں مدعو تھیں۔ تمام سرکاری ملازمین حتیٰ کہ ہائی کورٹ کے ججوں کو بھی حکومت کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس تقریب میں ضرور شرکت کریں۔ چونکہ ان دنوں بیرونی ممالک میں یہ خیال بھی عام ہو چکا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی حکومت ہے اور شہری سرگرمیاں بالکل معطل ہیں۔ اس لئے اس تقریب میں تمام سرگرمیوں کا اہتمام سراسر شہری رنگ لئے ہوئے تھا۔ یعنی پریڈ بھی طلبار، اور دیگر سول تنظیمیں کر رہی تھیں۔ اور دیگر رنگا رنگ پروگرام بھی طلبار سے ترتیب دلوائے جا رہے تھے۔ چونکہ ڈھاکہ کی سول انتظامیہ کے قانوناً سربراہ میرے شوہر تھے۔ لہٰذا اس تقریب کے مہمان خصوصی بھی وہی منتخب ہوئے۔

جب میرے شوہر تیار ہو کر جناح کیپ پہنے ہوئے تقریب میں شرکت کے لئے جانے لگے تو میں نے زیر لب آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ میرے اصرار کے باوجود وہ مجھے ہمراہ لے کر نہ گئے۔ اور جب تک وہ واپس نہ آ گئے جان سولی پہ ٹنگی رہی۔

تقریب غیر متوقع طور پر بہت ہی کامیاب رہی تھی۔ تقریباً بیس ہزار کا مجمع دیکھنے

کے لئے سٹیڈیم میں موجود تھا۔ اور بے شمار طلبار و طالبات اپنے اپنے پروگرام پیش کر رہے تھے۔ میں نے شکرانے کے نوافل ادا کئے کہ یہ تقریب بھی ہمارے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی اور اس کی شاندار کامیابی بظاہر مکتی باہنی کی شکست اور پاکستان کی کامرانی کو ظاہر کرتی تھی۔

دوپہر کو شعرار اور باقی دوستوں کا کھانا ہمارے ہاں تھا۔ کراچی سے سہبار اختر اور دلاور فگار آئے تھے۔ حمایت علی شاعر ٹکٹ بھیجے جانے کے باوجود نہ آئے۔ یہاں کے حالات سن کر محض مشاعرے کے لئے آنا ان کے نزدیک عقل کی دلیل نہ تھی۔ میرے شوہر کو افسوس ہو رہا تھا کہ "بھئی اگر نہیں آنا تھا تو پہلے بتا دیتے تا کہ کسی اور کو بلا لیا جاتا۔" دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری نے ماحول کے بوجھل پن کو خاصا ہلکا پھلکا بنا دیا اور تھوڑی دیر ہم حالات سے بے نیاز ہو کر ہنسنے ہنسانے میں مصروف ہو گئے۔

رات کو ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو میں مشاعرہ تھا۔ در اصل مغربی پاکستان سے شعرا اسی مشاعرے کے لئے تھے۔ باقی تمام مشاعرے تو "جھونگے" میں منعقد ہو رہے تھے۔ مشاعرے کی صدارت جنرل نیازی کر رہے تھے۔

ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے سٹوڈیو میں اسٹیج پر شعرا تشریف فرما تھے اور ان کے بیچوں بیچ جنرل نیازی شلوار قمیض اور طرحدار کلاہ پہنے اپنی پوری وجاہت، اور رعب و دبدبے کے ساتھ بیٹھے تھے۔

وہ بھی میری زندگی کا ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ پاکستان کی پوری تاریخ میں اس اہتمام سے کوئی مشاعرہ منعقد نہ ہوا ہوگا۔ اسٹیج کے سامنے نشیبی جگہ پر کرسیاں بچھی تھیں اور وہاں سامعین دم سادھے خاموش بیٹھے تھے۔ اسٹیج کے چاروں طرف اور ہمارے پیچھے عنابی ٹوپیاں پہنے کمانڈوز نہایت مستعدی سے کھڑے تھے۔ فضا میں ایسا تناؤ تھا کہ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ محدود وقت تھا۔ مقامی شعراء میں بنگالی شاعر بھی تھے۔ صہبا اختر نے اپنے مخصوص جوش سے اپنی نظم "پرچم" سنائی اور ضمیر جعفری صاحب نے حالات کی نزاکت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص ترنم میں ایک نظم پڑھی جس کے پہلے بند میں بنگالی الفاظ کی آمیزش تھی اور اس بند کی تکرار بھی نظم میں آئی تھی۔ وہ بند تھا:۔ "ایکوتا .... ایکوتا .... ایکوتا .... بھالو بھاشا ایکوتا ..." یعنی اتحاد کتنا اچھا لفظ ہے۔ اور کچھ یاد نہیں کہ کس نے کیا پڑھا۔ مگر آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ نیازی صاحب نے اپنی گھن گرج آواز میں ایک تقریر کی تھی جس کا تعلق مشاعرے سے نہ تھا مگر جس میں ان کے مخصوص دعووں کی تکرار یوں تھی "ہم اپنے اس خطے کی حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دینے سے گریز نہ کریں گے اور اگر بھارت نے کبھی جنگ کا ارادہ کیا تو اسے ایسی شکستِ فاش کا سامنا کرنا ہوگا جسے وہاں کی کئی نسلیں مدتوں تک نہ بھول سکیں گی۔" اور اس لمحے اپنے وطن کی بہادر فوج کے سربراہ کے دعویٰ پر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے ان دعووں پر کتنا اعتماد تھا۔ اس دلیرانہ تنبیہہ پر کتنا ناز اور کامل بھروسہ تھا۔

مشاعرہ جلد ختم ہو گیا۔ مگر ابھی ہم گھر جا کر سونا نہیں چاہتے تھے۔ ان دنوں تنہائی اور تاریکی سے خوف آنے لگا تھا۔ اندھیرے میں حالات کی درشتی آدم خور شیر کی خونخوار آنکھوں کی طرح چمکنے لگتی اور تنہائی اس خونی چمک کی تاب نہ لا کر سہم کر دبک جاتی۔

ہم نے مغربی پاکستان سے آنے والے شعراء اور اپنے دوستوں سے درخواست کی کہ وہ ہمارے ساتھ ہی گھر چلیں تاکہ مختصر ترین مشاعرے سے جو تشنگی باقی رہ گئی ہے اسے گھر جا کر پورا کیا جائے۔

ہماری موٹریں پورچ میں رکیں تو دیکھا کہ حمید صاحب اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں پر بیٹی باندھے، بندوق بڑے اہتمام سے پکڑے پریشان کھڑے تھے۔ جلدی سے آگے

بڑھے اور کہنے لگے۔ "صاحب! آپ کو نہیں معلوم یہاں تو باہر سڑک پر حملہ ہو گیا تھا۔" "کیسا حملہ ۔۔؟؟ کس نے کیا ۔۔؟؟" بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔ "صاحب! یہ تو معلوم نہیں مگر لگاتار گولیاں چلنے کی آواز آتی رہی۔ دیکھئے ہماری گارڈ کے سب افراد چوکس ہو رہے ہیں۔" واقعی گارڈ کے سب سپاہی بندوقیں تھامے مستعدی سے کھڑے تھے۔ میرے شوہر ٹیلیفون کی طرف گئے تاکہ واقع کی نوعیت معلوم کر سکیں۔ معلوم ہوا کہ ایک سفید رنگ کی کار بہت تیز رفتاری سے اس علاقے سے گزری تھی اس میں سے بے مقصد گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ چونکہ سرکٹ ہاؤس بھی پاس ہی تھا۔ اس پر بھی گولیاں چلائی گئیں۔ وہ کار جس برق رفتاری سے آئی تھی اپنا کام کر کے اسی تیزی سے چلی گئی۔ کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ مگر پورے علاقے میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ چکی تھی۔

بعد میں سنا کہ فرضی بنگلہ دیش ریڈیو نے اعلان کیا تھا کہ جنرل نیازی جب ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں آ رہے تھے تو ان پر حملہ ہوا۔ حالانکہ یہ بات بالکل بے بنیاد تھی۔ مگر اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مکتی باہنی کا حملے کا پروگرام تھا۔ مگر حفاظتی انتظام اتنے مکمل تھے کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور پھر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق دہشت پھیلانے کا یہ بھونڈا طریقہ اختیار کیا۔

جب ذرا سکون سے بیٹھے تو خیال آیا کہ ہمارے چند دوست ریڈیو اسٹیشن نہ گئے تھے۔ حالانکہ نسیم صاحب شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ میرے شوہر اور حسن بھائی سرکٹ ہاؤس گئے تاکہ ان لوگوں کو بھی ہمراہ لے آئیں۔

سرکٹ ہاؤس میں سب ہراساں تھے۔ بیرے، بٹلر، چوکیدار، باہر گارڈ کے سپاہی سب پریشان تھے۔ ہمارے چند دوستوں نے بتایا کہ وہ تیار ہو کر مشاعرے میں شرکت کے لئے نکل ہی رہے تھے کہ سرکٹ ہاؤس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ان

کے بقول وقفے کے بعد دوبارہ بھی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ چونکہ صحیح صورت حال کو جاننا مشکل ہو رہا تھا۔ لہٰذا یہی غنیمت جانا کہ سب بالائی منزل میں اپنے کمروں میں دبک جائیں۔

سرکٹ ہاؤس سے بھی دوست آگئے۔ اور ہم لوگوں نے شعر و شاعری کی محفل دوبارہ سجانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے کہ پورے ماحول پر دہشت و خوف مسلط تھا۔ صہبا اختر اپنے ڈھاکہ آنے کے فیصلہ پر کچھ خوش نظر نہ آتے تھے۔ موت کی وادی میں اپنی خوشی سے آنا کچھ ایسا قرینِ عقل اقدام بھی نہ لگتا تھا۔ بہرحال اب وہ آ تو چکے تھے۔ مگر دوسرے روز کے مشاعرے کے لئے کسی قیمت پر رُکنے کو تیار نہ تھے۔ وہ متعجب تھے کہ جس ماحول میں بم پھٹ رہے ہیں۔ گولیاں چل رہی ہیں، ہم ہنس بول کیسے رہے ہیں ؟؟—

ہم ان بارودی صداؤں کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ آواز آتی " دھڑام — "کیا ہوا ؟ — کہاں ہوا — ؟؟" بیک وقت کئی افراد بول پڑتے۔ نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور بغیر کسی کے جواب کے جُھک جاتیں اور ہم سب کے چہروں پر از خود لکھ جاتا۔" اب کیا ہو گا —" ہماری زندگی " کیا ہوا — ؟" اور "کیا ہو گا —" کے گرد طواف کر کے اس قدر بے حس ہو چکی تھی کہ ہر چیز بے معنی لگتی تھی۔

۱۵ر اگست کی شام کو مقامی اردو بولنے والے حلقہ نے مشاعرے کا بندوبست کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو میری طبیعت اب مشاعرے کے نام سے زچ ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا جیسے یوم آزادی کی معراج محفل مشاعرہ میں ہی پنہاں ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے ہاں تقلید کی رسم تو پُرانی ہے نا — اس سے گریز ممکن نہ تھا۔

یہ تقریب دیوان دراثت علی خان صاحب کے ہاں منعقد ہوئی تھی۔ رات کا وقت تھا، ہم لوگ ان کا گھر تلاش کر رہے تھے کہ ایک رضاکار لڑکا ہاتھ میں بندوق پکڑے

ہوئے ہماری طرف آیا اور بندوق آگے کرکے پوچھنے لگا۔ "کون ہیں آپ ؟ کہاں جانا ہے ؟" سولہ سترہ برس کا لڑکا جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، بندوق ڈھنگ سے پکڑ بھی نہ سکتا تھا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بہادری کا مظاہرہ کرنے پر مصر تھا۔ ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا اور اس کی لرزاں دلیری پر خنداں آگے بڑھ گئے۔

ان دنوں رضاکار فورس کی بھرتی ہو رہی تھی تاکہ انہیں شہری حفاظت پر مامور کیا جا سکے۔ مختصر سی ٹریننگ کے بعد ان کے ہاتھوں میں یہ آتشیں ہتھیار دے دیا جاتا تھا۔ اکثر یہ رضاکار شہید بھی ہو رہے تھے۔ مگر ان کے جوش و ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا تھا۔

دیوان صاحب کے ہاں مشاعرہ شروع ہوا تو یوں لگتا تھا کہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہال میں قریباً سبھی شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک پڑھنا ختم کرتا تو جھٹ سے دوسرا مائیک کو تھام لیتا۔ میں اور جیبہ بھابی ہال کے باہر برآمدے میں دیوان صاحب کے اہل و عیال کے ساتھ اس طرح بیٹھی ہوئی تھیں کہ کھڑکیوں میں سے تمام کارروائی بخوبی دیکھ اور سن سکتی تھیں۔ ہر شاعر کی نظم یا غزل کا ایک ہی مصرع طرح تھا "بنگال کے ناگفتہ بہ حالات" شعروں میں قنوطیت اور یاسیت ہر پہلو سے نمایاں تھی۔ یہاں تک کہ پورے ماحول کو یاسیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جیبہ بھابی گردو پیش پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ "پاس والے گھر کی بالکونی میں یہ جو شخص بنیان پہنے ہوئے کھڑا ہے نا، کیا معلوم مکتی باہنی کا ہی ہو۔ ؟"

ہم لوگ شعراء کی ان گنت تعداد سے سخت بیزار ہو چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ہم دونوں کے علاوہ وہاں ہر انسان ہی شاعر تھا۔ وہ شخص بالکونی پر جھکا ہوا بدستور کھڑا تھا۔ جیبہ بولیں۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ شخص بھی شاعر ہی ہوگا۔ کہیں وہیں سے کھڑے کھڑے اپنی غزل سنانے لگ جائے۔" مگر بوریت اب اس نہج پر پہنچ چکی تھی

کہ جبیبہ کے چٹکلے بھی اسے کم نہ کر سکتے تھے۔

دیوان صاحب کا ایک گرانڈیل براؤن ساکتا بار بار ہمارے پاس آکر خوف میں اضافہ کر دیتا۔ جبیبہ بار بار اسے بند کرنے کے لئے کسی کو کہتیں۔ مگر ایک معصوم صورت خاتون ہر دفعہ یہی جواب دیتیں "نہ نہ۔ ڈر جائے گا"۔ جبیبہ جل گئیں۔ "اور ہم جو ڈر رہے ہیں اس کا بھی تو کچھ کیجئے۔" خاتون کو ہم پر رحم آگیا۔ ہم جو حرفِ مکرر بنی ہوئی ہر جگہ موجود ہوتی تھیں۔ "کیا کام کرتے ہیں آپ کے میاں۔ ؟" وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔ "کرنا کیا ہے۔ بس شاعری کرتے رہتے ہیں۔" جبیبہ کی چٹکلے چھوڑنے کی فطرت بیزاری کے باوجود عود کر آئی۔ "آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟"۔ وہ خاتون اب جبیبہ سے مخاطب تھیں۔" وہ۔ وہ تو بس شاعری سنتے رہتے ہیں۔" جبیبہ نے دسان سے جواب دیا۔ "ارے! آپ دونوں کے میاں بس یہی کام کرتے ہیں۔" دنیا بھر کی معصومیت اس کے چہرے پر تھی۔ "جی ہاں! فی الحال تو یہی لگتا ہے۔" جبیبہ نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

اللہ کا شکر ادا کیا کہ مشاعرے کے اختتام کا بالآخر اعلان ہو رہا تھا اور اسکے ساتھ ہی مشاعروں کا جو سلسلہ چل نکلا تھا اختتام پذیر ہوا۔

زندگی بموں اور گولیوں کی آوازوں سے مانوس ہو کر معمول پر آچکی تھی۔ برآمدے کے لئے بانس کی بنی ہوئی کرسیاں خریدنے کی ضرورت پیش آئی تو میں اور جبیبہ بھابی ناظر صاحب کے ساتھ بانس بازار چل دیں۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔

ہم اپنے اطمینان سے خریدی ہوئی کرسیاں ناظر صاحب کے حوالے کر کے واپس آرہی تھیں کہ عین چوک میں گاڑی اڑیل ٹٹو کی طرح اڑ گئی۔ ڈرائیور کی بعد کوشش کے باوجود گاڑی نے سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سمے ہم دونوں کا نڈر پن ایک دم بھک سے اڑ گیا۔ ویران اور سنسان سڑکوں پر ٹیکسی کا ملنا بھی ناممکن تھا۔ لہٰذا مجبوراً ڈرائیور کو بھیجا

کہ پاس کسی ٹیلیفون پر اطلاع دے کر کوئی دوسری گاڑی منگوا لے۔ جب ڈرائیور بھی چلا گیا تو ہم دونوں سُورما بننے والی خواتین بھائیں بھائیں کرتے ہوئے ماحول میں اپنی حماقت پر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے سہم سہم کر قرآنی آیات کا وِرد کرنے لگیں۔ وہ آدھ گھنٹہ اتنا طویل ہو گیا کہ گزرتا ہی نہ تھا۔ نہ ہمیں راستے معلوم، نہ علاقے کی پہچان۔ ہمیں تو یہ تک نہ معلوم تھا کہ ہم اس وقت کہاں کھڑی تھیں۔

ع کشتیاں سب کی کنارے پر پہنچ جاتی ہیں
ناخدا جس کا نہ ہو، اس کا خدا ہوتا ہے

ہمارا اس وقت صرف خدا ہی تھا۔ دوسری گاڑی آ گئی اور ہم لوگ بخیریت تمام گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ صبر آزما لمحات مجھے آج بھی یاد ہیں۔

ناگہاں اُس رنگ سے خونبانہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

غالباً ۲۸ر ستمبر کا روز تھا۔ جب ٹکا خان صاحب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ ڈاکٹر مالک صاحب نے ابھی گورنر کے عہدے کا چارج لینا تھا۔ ڈاکٹر مالک ہمارے دوست ایم آر ملک کے بڑے بھائی تھے۔ گو ٹکا خان صاحب کو میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کے جانے کا سخت افسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا جیسے موسلا دھار برسات میں کھڑے ہوئے ہاتھ سے کوئی تانی ہوئی چھتری چھین لے۔

ٹکا خان صاحب چلے گئے۔ ڈاکٹر مالک صاحب نے مشرقی پاکستان کی گورنری کا چارج لے لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کہاں تک سچ ہے مگر میں نے سنا تھا کہ مالک صاحب نے چارج لینے سے قبل اپنے کئی دوستوں اور مخالفوں کو خطوط لکھے تھے جن کا متن کچھ

اس طرح تھا کہ "۔ میں ان ہنگامی حالات میں اس عہدے کا چارج اپنی قوم کی بہتری اور بھلائی کے خیال سے لے رہا ہوں۔ پھر بھی اگر تمہارے نزدیک میرا یہ قدم غلط ہو تو مجھے معاف کر دینا۔"

میں نے سنا کہ ڈاکٹر مالک کے عہدے کا حلف لینے والی تقریب بہت سادہ تھی اور ان کا پیغام اس سے زیادہ سادہ و متین تھا۔ انہوں نے نہایت متانت و سکون کے ساتھ آہستہ آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی اور کہا کہ میرے لئے آپ سب دعا کریں — اور بس۔

اس تقریب کو چار روز گزر چکے تھے کہ ایک شام جنرل نیازی صاحب چند سینئر افسران کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ چودھری صاحب کے بھائی کی وفات پر پرسہ دینے آئے تھے۔ میں ان کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ میں نے برسبیل تذکرہ گورنر صاحب کے حلف لینے کی تقریب کا ذکر کیا۔ نیازی صاحب ہلکے سے مسکرائے۔ چاروں طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا اور انگریزی میں دریافت کیا — "کون گورنر — ؟؟" ان کے یہ الفاظ وضاحت طلب نہ تھے۔ مگر انہوں نے خود ہی انگریزی میں تشریح کر دی — "میں گورنر ہوں —" سب خاموش ہو گئے۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہی تھی — اب مشرقی پاکستان میں ہر قسم کا اقتدار و طاقت ایک شخص میں مرکوز ہو چکے تھے اور اس نقطے نے قومی المیہ کی طرف بڑھنے کی ہماری رفتار دو چند کر دی تھی۔

ایران کے قومی دن کی تقریب تھی۔ ایرانی قونصل خانے میں دوپہر کا کھانا تھا۔ اور شاہِ ایران کی تاجپوشی کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بہت سے پاکستانی اہل کار، سرمایہ دار، صنعت کار اور سیاستدان مدعو تھے۔ ہمارے ہاں ایک خاص طبقہ ہے۔ جس کی قیامت کی تیز نظریں طاقت و اقتدار کے اصلی محور کو کھوج لیتی ہیں اور پھر وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے گرد گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان بے یقینی و بے

اطمینانی والے حالات میں بھی اس طبقے کے مرد و زن نے قوت و اقتدار کا مینار پہچان لیا تھا اور وہ مقناطیسی کشش کے ساتھ نیازی صاحب کے گرد طواف کر رہے تھے۔

ان دنوں نیازی صاحب اس علاقے کے مطلق العنان فرمانروا تھے۔ انکے اختیارات خدا تعالےٰ سے کیا کم ہوں گے (خاکم بدہن) ۔ یعنی وہ اس علاقہ کے ہر نشیب و فراز، ہست و بود اور موت و زیست پر قادر تھے۔ بلا شرکتِ غیرے ــــ اس علاقے کی کوئی قوت ان کے کسی عمل کی باز پرس کی مجاز نہیں تھی۔ مگر تھے تو وہ انسان ہی۔ ایک مشت خاک ــــ محدود ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے مالک ــــ خدائے تعالیٰ کی اتنی بڑی وسیع کائنات کی ایک کمزور و مجبور مخلوق ــــ لامحدود اختیارات، اس مجبور مخلوق میں صفاتِ ربوبیت تو نہ پیدا کر سکتے تھے۔

ہم لوگ ڈاکٹر مالک صاحب کی پوری فیملی کو چوآ ڈانگا سے جانتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہ تھی۔ اس دن ہم ان کے چھوٹے بھائی ایچ آر ملک کے ساتھ جو ہمارے دوست تھے۔ ان کے شہر والے گھر میں ان سے ملنے کے لئے گئے تھے ــــ ٹھیک ساجامع مکان جس کی ہر شے سادگی کا وقار لئے ہوئے صاف اور ستھری تھی۔ ڈرائینگ روم کو میں نے اچھی طرح دیکھا۔ فرنیچر اور دیگر آرائشی چیزیں بالکل ضرورت کے مطابق سیدھی سادھی، بے تصنع و بے تکلف تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ اس شخص کا مکان ہے جو سالہا سال سے کئی مغربی ممالک کا مسلسل سفیر رہا ہے۔ چمکتے ہوئے صاف برتنوں میں چائے آئی۔ چائے کے ساتھ مسز ملک کے اپنے بنائے ہوئے بسکٹ تھے۔

مسز ملک آسٹریا کی رہنے والی خاتون تھیں مگر اسلام اس طرح قبول کر چکی تھیں کہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتیں۔ ڈاکٹر صاحب خود بے حد نیک اور مذہبی انسان تھے۔ ان کی ہی بھاری بھرکم اور اٹل شخصیت کا اثر تھا کہ ان کی بیگم مذہب میں اسقدر ڈوب چکی تھیں، ورنہ ہم نے تو یہی دیکھا تھا کہ جو اپنے ہم وطن، مغرب کی خواتین کو

اپناتے ہیں وہ اپنے مذہب تو کیا اپنی تہذیب و زبان سے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا جو شادی شدہ تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں ان دنوں کراچی میں مقیم تھا اور ایک بیٹی جو فرانس میں مسٹر مانٹی سوری کو ان کے بچوں کے لئے مقبول ترین طریقہ تعلیم میں اعانت کر رہی تھی۔ مسز ملک ہر وقت ساڑھی کے پلو سے سر ڈھانکے رہتیں۔ انہوں نے ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ جب وہ پیرس میں تھیں تو ایک روز بس پر چڑھتے ہوئے، جب کہ ان کے ہاتھ میں تھرماس، بیگ اور چھتری پکڑے ہوئی تھی ان کا پلو سر سے کھسک گیا۔ ملک صاحب نے فوراً احساس دلایا کہ تمہارا سر ننگا ہے۔ بیٹی جو ہمراہ تھی بولی۔ "ابا! یہاں کون دیکھتا ہے کہ سر ڈھکا ہے یا ننگا ہے۔" مگر ملک صاحب نے جواب دیا۔ "بیٹی! ہمیں یہاں کے لوگوں سے کیا غرض۔ ہم نے تو اپنے اصولوں کو دیکھنا ہے۔" ڈاکٹر مالک کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا — وہ بنگال کے ایک بہت اچھے خاندان کے بہترین فرد تھے۔ اور ان پر بحیثیت ایک ہم وطن اور بحیثیت ایک مسلمان کے بجا طور پر فخر کیا جا سکتا تھا۔

ایچ آر ملک امریکہ میں پاکستان کے کمرشل اٹاچی بن کر جا رہے تھے ہمیں ان کے جانے کا افسوس بھی تھا اور خوشی بھی کہ چلو ایک اور دوست اس آتشکدہ سے نجات پا گیا۔ انہیں الوداع کہنے کے لئے ہم لوگ ایئر پورٹ پر گئے۔ مسز ملک کی بہنیں اور ملک صاحب کی بھاوج، ڈاکٹر مالک کی بیگم وہاں الوداع کہنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں بھی مسز ڈاکٹر مالک جو وہاں کے گورنر کی بیگم تھیں۔ اپنی سادگی اور سختی سے ساڑھی کا پلو سر پر جما کر ہاتھ سے پکڑے ہوئے سب سے منفرد نظر آ رہی تھیں۔ جاتے ہوئے تو کھی اور تیتھی نے احتراماً میرے پاؤں چھوئے (یہ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ یہ ہندوانہ رسم نہ جانے کس طرح وہاں کے مسلمانوں میں اس قدر رواج پا چکی تھی) مسز ملک سب سے گلے ملیں۔ وہ وطن سے دور جا رہی تھیں۔ لہٰذا رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے

وہ ہم سب کو خدا حافظ کہہ کر جہاز کی طرف چل دیں۔

ایسٹ پاکستان کی وزارتیں قائم ہونی تھیں۔ تاکہ سول حکومت کا ایک ڈھانچہ کھڑا کیا جا سکے۔ کیوں کہ ہمیں مالی امداد دینے والے ممالک بھی ہماری عسکرانہ طرزِ حکومت پر معترض تھے۔ کئی حضرات وزارت کی کرسی سنبھالنے کے لئے کوشاں تھے۔ ان ہی دنوں ڈولی آزاد اپنی شخصیت کی تمام رنگینیوں کے ساتھ ڈھاکہ میں آگئیں۔ یہ دلچسپ خاتون مغربی پاکستان میں مقیم تھیں۔ مگر کرسیٔ وزارت کے لئے قسمت آزمائی کرنے ڈھاکہ آئی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا اور بیٹی شادی شدہ تھے اور ایک بیٹی بی اے کا امتحان دے کر فارغ بیٹھی تھیں۔ ڈولی کا اپنا اصلی نام نہ جانے کیا تھا۔ یہ تو یقیناً اس کا ڈاک نام ہوگا۔ مگر وہ اسی نام سے جانی اور پہچانی جاتی تھیں اور اسی نام سے ایوب خان صاحب کے دور میں قومی اسمبلی کی ممبر بھی رہ چکی تھیں — یہ بوگرہ کی "ست آنی بارٹی" سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر آزاد صاحب علم و ادب دوست تھے۔ شوہر کی منتخب اردو غزلوں کو ان ہی کی بنائی ہوئی دھن میں جب ڈولی اپنی سریلی آواز میں گاتی تو پوری محفل پر چھا جاتی۔ ایک تو غزلیات کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ دھن بھی بہت ہی اچھی ہوتی — اور پھر ڈولی کا گانے کا انداز و ترنم — ہم سب ہی ان کے مداح تھے۔

ڈولی نے ہم سب کو اپنے ڈھاکہ والے گھر میں جو نور الامین صاحب کے گھر سے بالکل ملحقہ تھا۔ رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ اس روز بہت رونق ہو رہی تھی۔ ڈولی کے تمام بچے موجود تھے (ان کے شوہر کراچی میں مفلوج حالت میں تھے) سول انتظامیہ کے اعلیٰ افسران اور سیاست دانوں کے علاوہ مسلح قوتوں کے اعلےٰ افسران بھی موجود تھے — ڈولی کا ہندو ملازم ٹھنڈے مشروب سب کو پیش کر رہا تھا۔ نیازی صاحب نے ازراہِ تکلم اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے رسان سے کہا —

"رام لال بروا" (صحیح نام غالباً میں بھول چکی ہوں) بروا ہندوؤں کی ایک ذات ہوتی ہے۔ نیازی صاحب چونکے ــ دوبارہ پوچھا۔ اس نے وہی نام دہرایا۔ مغربی پاکستان کی ایک سپاہیانہ شخصیت نے "بروا" کی حقیقت کو نہ سمجھا۔ وہ ہنسے اور بولے۔ "لوجی!ــ ہمیں تو مشروب بھی بھڑوے نے دیئے ہیں ــ" میں اور حبیبہ پاس ہی کھڑی تھیں ــ انہوں نے یہ بات ہم سے ہی مخاطب ہو کر کہی تھی۔ ہم دونوں کٹ کر رہ گئیں ــ ڈولی بلا کی ذہین خاتون تھیں، موقع کی نزاکت کو فوراً بھانپ گئیں۔ جلدی سے انہوں نے بَروا کے ہاتھ سے ٹرے خود تھام لی اور اسے وہاں سے چلتا کر دیا۔

ڈولی کو بہت اشعار یاد تھے اور برموقع و محل ایسے موزوں اشعار بولتیں کہ مزا آجاتا۔ اس روز مرکزی حکومت کے ایک بہت بڑے افسر جو ڈھاکہ کے دورے پر آئے ہوئے تھے وہ بھی آئے ــ مگر کافی دیر سے ــ ڈولی کے بقول وہ پینے سے فارغ ہو کر ہی آسکتے تھے۔ غالباً اس دن وہ زیادہ ہی پی چکے تھے۔ ایسی بہکی بہکی حرکتیں کر رہے تھے کہ ہمارے سر شرم کے مارے جھک گئے۔ میں سوچتی رہی کہ ہمارے مذاق کا یہ رُخ کیسا ہے ــ؟ اور ہمیں نہ جانے یہ کہاں پہنچائے گا۔؟؟ یا شاید اونچی سوسائٹی کی خصوصیت کے یہی اطوار ہوں گے اور ان کو تعجب سے دیکھنا میرے اپنے ذہن کی پسماندگی کی علامت تھا۔

ہر روز یہی سنتی کہ ڈولی کو فلاں وزارت مل رہی ہے ــ ڈولی ملتی تو میں مذاقاً کہتی "دیکھو وزیر بن کر بھول نہ جانا ــ" وہ ہنس کر کہتیں ــ "دیکھتی جاؤ وزیر بنتے ہی تمہیں بھی اپنا سیکرٹری بنالوں گی ــ" "اور مجھے بھی کچھ نہ کچھ ضرور بنانا ــ" حبیبہ ایسے موقعوں پر چوکنے والی نہ تھی۔ مگر ہر طرح کی کوششوں کے باوجود ڈولی وزیر نہ بن سکی ــ اور پھر وہ اپنی شخصیت کی تمام رنگینیاں سمیٹ

کر کراچی چلی گئیں ۔

ستمبر کے تیسرے ہفتے میں ہم سب کا میمن سنگھ جانے کا پروگرام بنا — مرد حضرات تو اپنے دورے پر جا رہے تھے ۔ میں اور حبیبہ وہی حرف مکرر بنی ساتھ لگ لیں ۔ چودھری صاحب، حسن بھائی، اور میرے شوہر ایک موٹر میں بیٹھے —— میں اور حبیبہ دوسری موٹر میں جا براجمان ہوئیں ۔ باہر نکل کر اپنے ساتھ جانے والی پولیس گاڑی دیکھی ۔ جس کے اوپر بڑی بڑی بندوقیں نصب تھیں تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم لوگ کسی محاذ جنگ پر روانہ ہو رہے ہیں ۔ مجھے بتایا گیا کہ رستہ بہت پُرخطر تھا ۔ کیوں کہ یہ مکتی باہنی کے مشہور ترین کمانڈر عبدالقادر صدیقی کا علاقہ تھا ۔ ہر روز پُل اڑائے جا رہے تھے ۔ گاڑیوں پر بم پھینکے جا رہے تھے ۔ اس کے علاوہ ہمیں سدھو پور کے جنگل سے گزر کر جانا تھا ۔ اس لئے یہ حفاظتی تدابیر ضروری تھیں ۔

سب سے آگے پولیس کی گاڑی، پھر افسران کی موٹر اور ان کے پیچھے ہم لوگ چلے جا رہے تھے ۔ اکثر ایسا ہوا کہ حفاظتی گاڑی اور دوسری موٹر ہم سے اتنی آگے نکل جاتی کہ بم تو کیا، کوئی چھڑیاں لے کر بھی ہمارے سامنے آجاتا تو ہم دونوں تھر تھر کانپتی موٹر سے نیچے اتر جاتیں ۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم مرزا پور پہنچے ۔

یہ ایک ہندو سیٹھ آر ۔ پی ۔ شاہا کا گاؤں تھا ۔ یہ سیٹھ سکندر مرزا کا بہت دوست تھا اور ان ہی کے نام پر اس نے اسی نسبت کا نام رکھا تھا ۔ اسی سیٹھ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا ۔ اتفاق دیکھئے کہ دونوں بیٹیوں نے مسلمانوں کے ساتھ شادی کی تھی اور دونوں ولایت میں سکونت اختیار کر چکی تھیں ۔ مگر فوجی ایکشن کے بعد آر ۔ پی ۔ شاہا اور اس کے بیٹے کو مسلح افراد گھر سے پکڑ کرلے گئے تھے اور پھر ان کا پتہ نہ تھا کہ کہاں ہیں ۔ سیٹھ کی چھوٹی بیٹی ان حالات کی اطلاع پا کر ولایت سے باپ کا کاروبار سنبھالنے مرزا پور آچکی تھی ۔

مرزا پور پہنچ کر ہمیں ٹنگاٹیل کے ایس۔ پی صاحب کے ساتھ سیٹھ کی بیٹی نے خوش آمدید کہا۔ مرزا پور ہسپتال بہت بڑا اور جدید طریقۂ علاج کی تمام سہولتوں سے پوری طرح آراستہ تھا۔ حتیٰ کہ کینسر کے علاج کے تمام جدید آلات وہاں موجود تھے ہم نے سارا ہسپتال گھوم کر دیکھا۔ ہندو طرز تعمیر کی سہ منزلہ عمارات پر مشتمل یہ ہسپتال اس علاقے کا غالباً سب سے صاف ستھرا شفاخانہ تھا۔ مریضوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید یہاں کی ہندو آبادی بھارت فرار ہو چکی تھی۔ ہسپتال کے بعد وہ خاتون ہمیں گرلز سکول میں لے گئیں۔ سکول کے وسیع احاطہ میں چاروں طرف کلاس روم قاعدے سے بنائے گئے تھے اور بیچوں بیچ ایک بڑے سے گراؤنڈ میں لڑکیاں صاف ستھری یونیفارم پہنے پی ٹی کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ بینڈ کی دھن پر پی ٹی کا مظاہرہ ہو رہا اور وہ خاتون ہم دونوں کے پاس کھڑی اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کے لئے مستقل خود سے نبرد آزما رہیں۔ مگر آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو آنکھوں سے اُمڈا چلا آرہا تھا اور وہ بڑے سے رومال میں آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے بار بار معذرت خواہ ہوتیں جیسے کہ وہ واقعی کسی جرم کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ ان کے بقول یہ پی۔ ٹی کی تربیت ان کے والد نے خود طالبات کو دی تھی اور وہ روز خود اس کا مظاہرہ دیکھتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے سیلِ اشک پر قابو نہ پا رہی تھیں۔

وہ خاتون بلک بلک کر سب کے سامنے یہی التجا کر رہی تھی کہ "صرف یہ بتا دیں کہ میرا باپ اور بھائی کہاں ہیں۔" وہ تعلیم یافتہ اور سمجھدار خاتون تھیں۔ سیاحت اور تجربے کی چاشنی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ بار بار یہی دہراتی۔ "میں یہ نہیں کہتی کہ ان کی گرفتاری کوئی ناجائز اقدام ہو سکتا ہے۔ ضرور انہوں نے کوئی بات کی ہو گی اور حکومت ان کی گرفتاری کے عمل میں بالکل حق بجانب ہو گی۔ اگر حکومت اجازت نہ دے گی تو میں کبھی ان سے ملنے پر اصرار نہ کروں گی۔ مگر مجھے صرف یہ تو بتا دو کہ میرا باپ اور

اکلوتا بھائی زندہ اور محفوظ ہیں۔" اس کی اس التجا کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ حکومت کے یہ بڑے بڑے اور ذمہ دار عہدیدار تو خود ہر بات سے لاعلم بالکل شطرنج کے بے جان مہرے بنے ہوئے تھے۔

یہ سیٹھ ضرور کوئی برا شخص ہی ہوگا جو اس انجام کو پہنچا۔ مگر یہ ہسپتال اور سکول اس کے مخیرانہ اشغال کے آئینہ دار تھے۔ ان دونوں اداروں میں ہر چیز مفت مہیا کی جاتی۔ یہ ایک بورڈنگ سکول تھا۔ بچوں کے یونیفارم، کتابیں، کھانا، رہائش ہر چیز مفت مہیا کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بچی کو سکول میں داخل کروا کے والدین ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد ہو جاتے۔ یہ بُرے لوگ نہ جانے کس طرح اتنے شاندار ادارے قائم کر لیتے ہیں؟ بھئی چالاک اور مکار ہوتے ہیں یہ لوگ —! ورنہ ہمارے اتنے اچھے اچھے کروڑپتی موجود ہیں۔ وہ ان اشغال میں اپنا وقت و پیسہ برباد نہیں کرتے — اور میرے ذہن میں مغربی پاکستان کے سر گنگارام ہسپتال اور دیال سنگھ کالج کے علاوہ کئی ایسے شفاخانے اور تعلیمی ادارے گھوم گئے جنہیں ہم اصلی چالو حالت میں برقرار بھی نہ رکھ سکے تھے۔

جب ہم ضلع ٹنگائیل کے صدر مقام پر پہنچے تو شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا — ڈسٹرکٹ ریسٹ ہاؤس میں ڈپٹی کمشنر اور انتظامیہ کے باقی افراد اور پولیس کا عملہ موجود تھا۔ مرد حضرات تو سرکاری کاموں میں لگ گئے اور میں — جو جسمانی اور روحانی تھکن سے بے جان ہو رہی تھی۔ بالائی منزل میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

جب کام سے فارغ ہو کر یہ لوگ اوپر آئے تو میں نے دیکھا کہ میرے شوہر خاصے غصے میں تھے اور چودھری صاحب اپنی دور اندیشانہ متانت کے ساتھ تحمل سے کام لینے کی تلقین کر رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ دی تھی کہ ضلع ٹنگائیل کی مرکزی تحصیل کے سرکل آفیسر کو مسلح افراد دفتر سے لے گئے تھے

اور اس کا اب کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے ۔ میرے شوہر کا کہنا تھا کہ "قانوناً انتظامیہ کا سربراہ میں ہوں ۔ میرے آفیسر کے خلاف ایکشن لیتے ہوئے کم از کم مجھے وجوہات سے مطلع تو کر دیا جاتا" —— میں چودھری صاحب کی حامی تھی اور مجھے اپنے شوہر پر خواہ مخواہ غصہ آنے لگا ۔ "بھئی حالات کیا ہیں ، وجوہات بیان کرنے والے —— اور حضرت ! اختیار کیا ہیں آپ کو صاحبانِ قوت و اقتدار سے کسی عمل کا جواز پوچھنے کے ۔ ؟ یعنی حد ہو گئی بھئی ۔ آپ کو اتنا بھی اندازہ نہیں کہ ملکی باہمی کی کوئی تعریف مقرر نہیں ہے ۔ اس لفظ کے پھیلاؤ میں ہر کوئی آسکتا ہے ۔ بغیر کسی تخصیص کے ۔" مگر میرے شوہر مُصر رہے کہ وہ بریگیڈیئر صاحب سے ضرور بات کریں گے ۔ میرے شوہر کو اپنے فوجی پس منظر پر خاصا زعم تھا ۔

اتفاق سے بریگیڈیئر صاحب بھی ٹینگائل آ گئے اور ڈپٹی کمشنر نے انہیں بھی رات کے کھانے پر مدعو کر لیا تاکہ غیر رسمی ماحول میں بات ہو سکے ۔ بریگیڈیئر صاحب نے رات کا دعوت نامہ قبول بھی کر لیا ۔

رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا ۔ سب سرکٹ ہاؤس میں موجود تھے مگر بریگیڈیئر صاحب کا انتظار ہو رہا تھا ۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔ انتظار ہوتا رہا —— بہت دیر کے بعد باہر فوجی جیپ کے رُکنے کی آواز آئی ۔ سب نے چوکس ہو کر قدموں کی چاپ پر کان لگا دیئے ۔ بریگیڈیئر صاحب اندر آئے ۔ بغیر کسی کی طرف دیکھے سیدھے بالائی منزل پر اپنی قیام گاہ میں تشریف لے گئے ۔ کسی نے کسی کو کچھ نہ کہا ۔ بس سمجھ لیا گیا کہ بریگیڈیئر صاحب کو کھانے میں اس وقت شرکت منظور نہیں ۔ میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور مجھے ہنسی آ گئی ۔ "چلے تھے بریگیڈیئر صاحب سے علاقے کے معاملات پر بات چیت کرنے ۔ وہاں تو حاضری ہی ناممکن تھی ۔" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک مسئلہ خود بخود حل ہو گیا ۔ نہ میرے شوہر کو حاضری میسّر ہوئی اور نہ

وہ ان سے بات چیت کر سکے۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔" اوپر والے کے بھید نیارے ہیں" میں نے زیر لب کہا اور باتوں میں مصروف ہو گئی۔

دوسرے روز سہ پہر چار بجے کے قریب ہم ٹنگائیل سے روانہ ہوئے میمن سنگھ کے سرکٹ ہاؤس کے ہال میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سرکاری ملازمین کے علاوہ مقامی شہری بھی موجود تھے۔ جاتے ہی مریم ہاشم الدین پر میری نظر پڑی۔ میں گرم جوشی سے اس سے بغل گیر ہو گئی۔ مسز ہاشم الدین نے بھی اسی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ یہ خاتون اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور قومی اسمبلی کی رکن رہ چکی تھیں۔ ہم نے ماضی کی باتیں شروع کر دیں۔ ان کے بھائی اعظم (ٹائیٹی) اب ٹنگائل میں بس گئے تھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے مجھے دوسرے روز اپوا کی ایک تقریب کے لئے مدعو کر لیا۔

اگلے دن چار بجے میں اور جیبہ بھابی اپوا کے فنکشن پر گئیں۔ کافی تعداد میں خواتین جمع تھیں۔ کچھ پرانی جاننے والیوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ تقریب حسبِ دستور ترتیب دی گئی تھی۔ تواضع کے طور پر لڑکیوں نے مختلف گیت بھی سنائے۔ سب، ہم دونوں سے محوِ گفتگو تھیں۔ مگر یوں لگتا کہ انہوں نے اپنے اصلی احساسات پر قفل چڑھا دیئے ہیں اور خود کو زبردستی گفتگو پر مجبور کر رہی ہیں۔

تقریب کے بعد ہمیں ایک نئی بات سوجھی کہ اپنے ان گھروں کو جن میں ہم لوگوں نے پچھلے زمانے میں زندگی گزاری تھی، دیکھا جائے۔ میمن سنگھ میں حسن بھائی — اے ایس پی — اور میرے شوہر اے ڈی ایم رہ چکے تھے۔

ہم پہلے اے ایس پی والے گھر میں گئے۔ ایک بنگالی افسر اپنے اہل وعیال کے ساتھ وہاں سکونت پذیر تھے۔ ہمیں ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگے۔ ہمارے ہمراہ وہاں کے ڈپٹی کمشنر کی جواں سال بیگم بھی تھیں۔ انہوں نے بنگالی میں ہماری آمد کا مقصد بتایا۔ ان صاحب کے چہرے کے تناؤ میں کچھ کمی آئی تو انہوں نے اپنی اہلیہ کو

آواز دی اور ہم لوگ مکان کے اندر چلے گئے۔ اندر جا کر ہم دونوں احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ مکان کی ہیئت بدل چکی تھی اور اس میں دیکھنے کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔

وہاں سے ہم اے ڈی ایم والے گھر میں گئے جو خالی پڑا تھا۔ غالباً وہاں کوئی افسر رہنے کے لئے آنے والا تھا۔ کیوں کہ پورا گھر دُھلا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ میں وہاں گیارہ برس کے بعد گئی تھی۔ مگر یوں لگا جیسے چند روز پیشتر ہی یہاں سے گئے ہیں۔ میں سامنے کے برآمدہ میں کھڑی یادِ ماضی میں محو ہو گئی۔ میری ننھی سی بچی جھالروں والے فراک پہنے میرے تصوّر میں گھومتی رہی۔ سامنے وہ دریا کا راستہ تھا جہاں وہ ننھی سی چھتری لئے اپنے ملازم کی انگلی پکڑے ہر شام سیر کے لئے جاتی تھی۔ سب کچھ وہی تھا۔ مگر سب کچھ ہی بدل چکا تھا۔ بس یادوں کے جھروکے جوں کے توں قائم تھے۔ میں ڈپٹی کمشنر کی نوعمر بیوی کو اپنے ماضی کے قصے سناتی رہی۔ عمر کے ماہ و سال کتنی جلدی بیت گئے تھے اور اب ہم حالات کے اس موڑ پر تھے جب یہ ماضی اپنی تمام حسین یادوں کے ساتھ ہم سے چھین رہا تھا۔

اس سندر، سنہری ریشے کی سرزمین پر ہمارا وجود ایک بوجھ بن چکا تھا۔ ایسا بوجھ جسے اتار پھینکنے کے لئے یہ ہر لحظہ تیار نظر آرہی تھی۔

ڈھاکہ پہنچ کر گولیوں اور بموں کی صداؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی پھر اپنے مخصوص ڈھرے پر رواں دواں ہو گئی۔

بے چارہ پیادہ تو ہے اِک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

ہمارے بیشتر اداروں سے جو خبر چھپتی وہ یہی ہوتی کہ مشرقی پاکستان کے حالات پر مکمل طور پر قابو پا لیا گیا ہے۔ سول حکومت برسرِ اقتدار ہے اور سب کاروبار معمول کے مطابق چل رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ جو دن گزر رہا تھا بنگال کے حالات کو بد سے بدتر بنا رہا تھا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے جرنلسٹ اور دیگر لوگ وہاں پہنچ رہے تھے کہ پوری دنیا اس علاقے کی آگ کی سرخی دیکھ رہی تھی۔ مگر ہمارے پیرِ مغاں سرخیٔ مے میں غلطاں، آشتی اور چین کے بیانات دے رہے تھے۔ مختلف ممالک کے قومی دنوں کی تقریبات میں شرکت کر کے سیاسی ذمہ داریاں نبھائی جا رہی تھیں۔ مگر اپنے ملک کے دوسرے بازو میں قدم رنجہ فرمانے کی فرصت نہ تھی۔ ہماری دیگر ممالک میں اِن سیاسی شرکتوں کو اغیار نہایت طنزیہ انداز میں بیان کرتے۔ مشرقی پاکستان میں کاروان کا ہر فرد

کسی نہ کسی نوعیت کے انتشار میں مبتلا تھا اور میر کارواں دور بیٹھا محفل ہائے طرب سجاتا رہا۔ بادلوں اور نغموں کی سرزمین خون اور آنسوؤں کا گہوارہ بنتی چلی گئی اور ہم حالات کے معمول پر آجانے کا مژدہ سناتے رہے۔ چشم بینا در و دیوار پہ کندہ دیکھ رہی تھی کہ ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ہمیں ابھی تک یہی خوش فہمی تھی کہ قوت کے زور سے اور ڈنڈے کے زور سے ہم سب کو "درست کر دیں گے۔"

فیل خانے کی سڑک پر دو بنگالیوں کو مار کر بے گور و کفن دو روز تک رکھا رہنے دیا گیا تاکہ تخریب کار اس نظارے سے عبرت حاصل کریں۔ بیگم جمشید صاحبہ نے مجھے ان دونوں تخریب کاروں کی سرگرمیوں کے متعلق بتایا کہ یہ دونوں فیل خانے کی ایک عمارت کی دیوار پر چڑھ رہے تھے۔ (یقیناً ارادہ بُرا ہی ہوگا) لہٰذا انہیں گولی مار دی گئی۔ اور پھر ان لوگوں کے بے گور و کفن لاشے بیچ سڑک پر دو روز کے لئے مصلحتاً چھوڑ دیئے گئے۔ تاکہ ان کا انجام تخریب کاروں کو سبق سکھائے۔ انہوں نے ٹھیک ہی سوچا ہوگا — کہ کارہائے مملکت خسرواں دانند — مگر میری حقیر رائے میں ہماری ایسی ہی مصلحتیں مکتی باہنی کی تعداد میں حیرت انگیز اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔

کفیل الدین محمود جو مغربی پاکستان میں مرکزی سیکرٹریٹ میں تھے تبدیل ہو کر ڈھاکہ آ گئے۔ انہیں ایچ۔ آر۔ ملک صاحب والا مکان الاٹ ہو گیا تھا۔ مگر فی الحال وہ شہر میں اپنے والدین کے ہاں رہ رہے تھے۔ ہمیں ملنے آئے، وہ ہمارے پرانے مشفق و دوست تھے۔ ہمارے درمیان گفتگو ہوئی۔ نہ جذبات تھے، نہ محبت اور نہ بظاہر نفرت۔ بس میکانکی انداز میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس لئے کہ زندہ لوگ ملیں تو از راہِ رسم

کچھ بولتے ہی ہیں ۔ ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ ہم ان کے ہاں جا کر سلطان الدین صاحب اور بیگم سلطان الدین سے ملیں گے ۔ وہ ۔ جو مجسم مہمان نواز ہوا کرتے تھے ... خاموش رہے کہ ہمیں جانے سے منع کرنا بھی غالباً ان کے بس میں نہ تھا ۔

دوسرے روز شام کے قریب ہم لوگ شہر میں گئے ۔ ہمارا ڈرائیور بنگالی تھا ۔ شہر کے چپہ چپہ سے واقف تھا ۔ وہ ہمیں تنگ سی گلیوں میں گھماتا ہوا ایک پرانی وضع کی عمارت میں لے گیا ۔ گنجان آباد علاقے کی گلیوں میں گائے بندھی ہوئی دیکھ کر مجھے اپنا وطن یاد آ گیا — بیٹھک میں پرانا اور مٹیالا فرنیچر ماحول کو زیادہ ہی افسردہ بنا رہا تھا ۔ بیگم سلطان الدین گھریلو ملگجی ساڑھی میں میرے پاس آ کر بیٹھیں ۔ یہ سب لوگ پاکستان کے بظاہر وفادار تھے ۔ پرانے خلوص سے ملنے کی کوششیں کر رہے تھے ۔ مگر ان کے چہروں پر موت کی سی سختی جو کھنڈی ہوئی تھی ۔ وہ اس بات کی غماز تھی کہ ہم نے ان کے ہاں جا کر دوستی کا ثبوت نہیں دیا ۔ ہم جو مغربی پاکستان کے افسر تھے ہمارا ان کے ہاں شہر کے اس گنجان علاقے میں جانا ، مکتی باہنی کے عتاب کو دعوت بھی دے سکتا تھا ۔ ہماری اخوت اور دوستی کی مقدس تسبیح کے دانے خاک میں اس طرح گم ہو چکے تھے کہ ان کا ڈھونڈ کر پھر سے پرونا ناممکن عمل لگتا تھا ۔

مسلسل اعصابی کھچاؤ سے میں کچھ علیل ہو گئی تو ڈاکٹر باسط (جو بنگالی ، مختصر سے انسان تھے اور جو پاکستان کے ایسے وفادار فرد تھے کہ انہیں فوج کی طرف سے کرنل کا اعزازی عہدہ دے دیا گیا تھا) نے ڈاکٹر زہرہ قاضی کو میرے پاس بھیج دیا ۔ یہ معمر خاتون وہاں کی بہت قابل لیڈی ڈاکٹر تھیں اور اب ریٹائر ہو کر پرائیویٹ پریکٹس کر رہی تھیں ۔ یہ کبھی کبھار میرے پاس آ جاتیں ۔ انہوں نے مجھے مشرقی پاکستان کے اندرونی علاقوں کے لوگوں کی حالت زار بتائی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ رات کو ان کے پاس مکتی باہنی والے آ جاتے اور گھر میں جو کچھ ہوتا زبردستی لے جاتے ۔ اس میں کھانا اور جنس سب کچھ ہی شامل ہوتا

صبح کو مکتی باہنی والوں سے چھٹکارا ملتا تو اپنے مسلح افراد آجاتے اور الزام لگاتے کہ "تم مکتی باہنی والوں کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔" اور ان پر ہر نوعیت کا عتاب نازل ہوتا بے چارے شہریوں کی جان، مال و عزت ہر وقت خطرے میں تھی۔ معماروں کے ہاتھوں بھی اور تخریب کاروں کے ہاتھوں بھی۔

نیپال کے کونسلر، یوپی کے کسی تعلیمی ادارے کے تعلیم یافتہ تھے۔ اُردو پر انہیں خاصا عبور تھا۔ غالب کے اشعار اچھے خاصے یاد تھے۔ ہمیں ان کی شخصیت بہت پسند تھی ــ اس رات کھانے پر ہمیں مدعو کیا۔ بس آٹھ ہی مہمان تھے ــ چودھری صاحب کہ خاموشی سے، بغیر کچھ کہے، ہم لوگ انہیں اپنے گروپ کا سربراہ تسلیم کر چکے تھے ــــ ڈاکٹر حسن، جبیبہ، میرے شوہر اور میں ــــ کہ سرکاری ڈیوٹی کے علاوہ اب ہر جگہ ہم پانچوں اکٹھے جاتے تھے۔ جنرل نیازی، جنرل رحیم اور ایک امریکی اہم شخصیت ــــ کھانے سے قبل ٹھنڈے مشروب کا دور چلا ــــ مے نوشی میں دونوں غیر ملکیوں کا ہمارے کسی مرد نے ساتھ نہ دیا ــــ ہمارے تینوں مرد حضرات تو خشک تھے ہی کہ حدیث بادہ و مینا و جام انہیں آتی ہی نہ تھی۔ میں نے اس مختصر عرصے میں جنرل نیازی اور جنرل رحیم کو کسی تقریب میں کبھی بھی شراب پیتے نہیں دیکھا۔ ان کی اس بات کی میں ہمیشہ معترف رہی ہوں۔ ورنہ تو ہمارے لوگ سفارت خانوں میں خوب شوقِ مے پورا کرتے ہیں۔

کھانے کی مختصر سی میز پر ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دم جنرل نیازی صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نیپال کے کونسلر سے مخاطب ہوئے ــ "یار! فلاں فلاں علاقے تم ہمیں دے دو۔ اور فلاں فلاں میدان تم ہم سے لے لو۔" سب چونک گئے۔ کونسلر نے بات ٹالنے کے لئے کچھ کہا مگر نیازی صاحب جوش میں تھے۔ دوبارہ انہوں نے لینے اور دینے والے پہاڑی علاقوں اور میدانوں کی وضاحت کی اور بولے ــــ

"بس اب ہو گیا معاہدہ ، ان سب کے سامنے ۔!" بالکل جیسے کوئی کمسن لڑکا اپنے دوست سے کہہ رہا ہو ۔ "دیکھو! تم میری یہ ہاکی لے لو اور اپنا بلاّ مجھے دے دو ۔ دونوں کی قیمتوں میں فرق بھی نہیں اور پھر یہ لین دین دوستی میں ہوتا رہتا ہے نا بھئی ۔"
چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا کہ یہ الفاظ کسی عام عمر، بکر یا زید کے منہ سے نہ نکلے تھے۔ یہ مذاق اس شخص نے کیا تھا جو اس علاقے میں پاکستان کی قوت کا "مسلمہ" ستون تھا ۔ جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ، غیر ملکی لوگ پرکھتے اور اس کا تجزیہ کر کے اُسے کئی کئی معنے پہناتے ۔

نیازی صاحب شاندار سپاہیانہ تجربات کے حامل، بہت عظیم جرنیل ہونگے ۔ مگر وہ سیاستدان نہ تھے ۔ اگر حالات نے سیاست کو ان پر خواہ مخواہ ٹھونس دیا تھا تو یہ ان کا قصور تو نہ تھا ۔ وہ ایک انسان تھے اور انسان کو ہر چیز میں خود بخود "یدِ طولےٰ" حاصل نہیں ہوا کرتا ۔ معمولی سے معمولی شعبۂ زندگی میں کاملیت حاصل کرنے کے لئے برسوں کی عرق ریزی درکار ہے ۔ اگر "کُن" کہہ دینے سے سب کچھ ہو سکتا تو انسانیت اور ربوبیت ایک نقطہ پر نہ آجاتی ۔! مگر ایسا کبھی نہیں ہوا ۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ۔ انسان انسان ہی ہے ۔ وہی مشیت خاک ، وہی لاچار و مجبور ، وہی محدود صلاحیتوں کا مالک، لامحدود اختیارات اسے مادرائے ہستی نہیں بنا سکتے ۔

حسن بھائی اور حبیبہ اپنا علیحدہ مکان لے کر اس میں چلے گئے تھے ۔ گو ان کا گھر قریب ہی تھا مگر وہ ہر وقت کی یکجائی نہ رہی تھی ۔ بم کے دھماکوں کی آواز پر جب "کیا ہوا ؟" اور "کیا ہو گا ۔ ؟ ؟" میرے منہ سے نکلتا تو کوئی مایوس ہنسی کے ساتھ یہ نہ کہتا ۔ "چھوڑیے بھابی! یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے ۔" اُوپر سے چوہدری صاحب بھی چھٹی پر لاہور چلے گئے تھے ۔

میرا چھوٹا بیٹا جو چوتھی جماعت کا طالب علم تھا اب وہ ڈھاکہ چھاؤنی کے آدم جی

سکول میں داخل ہو گیا تھا۔ شام کو اس کا ایک دوست عرفان آجاتا۔ دھوبی اور ڈرائیور کے بچوں کو ساتھ ملا کر ان کی خاصی بڑی ٹیم بن جاتی اور یہ لوگ کرکٹ یا فٹ بال کھیلتے رہتے۔ اس شام میں اپنے شوہر کے ساتھ گھر کی سڑک پر ٹہل رہی تھی۔ چودھری صاحب کے آنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ ہم لوگ کھڑے ہو کر بچوں کو کھیلتے دیکھنے لگے پورچ کی طرف جو نظر گئی تو دیکھا چودھری صاحب اپنی مخصوص چال کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

"ارے!" تعجب اور خوشی کے مارے میں چیخی۔ "آپ کو تو ابھی کچھ روز کے بعد آنا تھا۔" ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ "مغربی پاکستان میں تو جنگ کا سودا ہو رہا ہے۔ یہی سنتے تھے کہ کسی لمحے بھی جنگ چھڑ جائے گی"۔ "یہ تو اور بڑی وجہ ہے کہ آپ کو ابھی نہیں آنا چاہیئے تھا۔" ہنس کر بولے۔ "جنگ چھڑ جاتی تو پھر میں کیسے آتا"۔ "بھئی نہ آتے یہاں کون سے لڈو بٹ رہے تھے۔" میں چڑ گئی۔ "ہاں — یہ تو ٹھیک ہے مگر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔" "بھئی حد ہو گئی"۔ مگر دل ہی دل میں چودھری صاحب کے آنے سے میں خوش تھی۔ ان کی موجودگی ہمارے لئے ذہنی سہارا تھی۔ ان کی موجودگی قوت کا احساس بھی تو پیدا کر دیتی تھی۔

ہمارا دھوبی ہندو تھا۔ اس علاقے میں یہ واحد ہندو تھا۔ باقی قریباً سب بھارت فرار ہو چکے تھے۔ غالباً کمشنر ہاؤس کی پناہ گاہ اسے یہاں حفاظت کا احساس دلا رہی تھی — وہ آتا تو ہاتھ باندھ کر "اماں! اماں!" کی رٹ لگاتا اور فوراً سر کو نیچے زمین پر ٹکا دیتا۔ اسے میں نے کئی مرتبہ بتایا کہ ہمارے مذہب میں خدا لئے برحق کے علاوہ کسی کے سامنے یوں سر نہیں جھکاتے۔ مگر اسے کبھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ آتے ہی کپڑے ایک طرف رکھ دیتا اور ہاتھ باندھ کر آنکھیں کبھی بند کرتا، اور کبھی کھولتا اور مجھے "اماں" کہہ کر جلدی جلدی کچھ بولنے لگتا۔ اس کی حرکات اتنی

مضحکہ خیز ہوتیں کہ حبیبہ بھابی کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا۔

ایک روز یہ آیا تو بہت پریشان تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجسٹریٹ کے پاس اس کا کوئی مقدمہ تھا جس میں اس کی بیوی کو بھی پیش ہونا تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی وہاں جائے اور لوگ اسے دیکھیں۔ نہ جانے کیوں عورتوں کی بھی ان دنوں خزانے کی طرح لوگ حفاظت کرتے تھے۔ میں نے کسی طرح اس کی بیوی کی پیشی ختم کروا دی۔ بہت مشکور تھا۔ پھر ہاتھ باندھ کر بولا۔ "اماں! میں گھر میں میلاد کرواؤں گا۔" "بھئی دھوبی تم تو ہندو ہو، میلاد کیسے کرواؤ گے؟" اس کی باتیں مجھے دلچسپ لگتی تھیں۔ "اماں! جس طرح آپ میلاد کرتے ہیں، میں دُرگا پوجا کرواؤنگا مگر ہے تو عبادت ہی نا۔ کیرتن کا کچھ شور ہو گا۔ آپ اس کی اجازت دے دیں۔" مجھے اس کی ہوشیاری پر ہنسی آگئی۔ میں تو اسے ایک احمق شخص سمجھتی تھی۔ مگر ع

دیوانہ بکارِ خود ہوشیار

وہ تو کافی عقلمند اور ہوشیار نکلا۔

ہمارے گھر کے قریب جتنے بڑے بڑے بنگلے تھے وہ بنگالی وزراء کو دے دیئے گئے تھے۔ ان وزراء کو ہم سے زیادہ مکتی باہنی کی طرف سے خطرہ تھا۔ ان کے گھروں پر پولیس کی گارڈ بھی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں بڑی بڑی سرخ لائٹیں لگا دی گئی تھیں جو رات بھر جلتیں۔

ایک شب بارہ بجے کا عمل ہو گا کہ گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ ہم لوگ چونک کر اٹھے۔ پھر تو گولیوں کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ تڑ تڑ تڑ تڑ تڑ تڑ..... نہ ختم ہونے والی تڑ تڑ — کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ سب سے پوچھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ بس گولیاں چلنے کی مسلسل آواز آئے چلی جا رہی تھی، بالکل پاس، جیسے زبردست حملہ ہو رہا ہو۔ گھر کی گارڈ کے تمام سپاہی مستعد ہو گئے۔ باہر برآمدے

میں دیکھا تو اشرف اور حمید دونوں بندوقیں لئے کھڑے تھے۔ "بھئی ہوا کیا ۔ ؟"
"پتہ نہیں صاحب !" بندوقیں چلنے کی مسلسل آوازیں ۔ گھر کے پچھلی طرف گئی۔ باورچی خانے سے باہر لوہے کی پیچدار سیڑھیوں پر بڈھے خانساماں پیاز کاٹنے والی چھری پکڑے ہوئے بیٹھے تھے ۔ مجھے ان کا ہتھیار اور مستعدی دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ چودہری صاحب غالباً کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے ۔ میرے شوہر نے ڈاکٹر حسن کو فون کیا وہ کہنے لگے "میرے گھر کے اندر لان میں بھی گولیاں چل رہی ہیں ۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کیا بات ہے ۔" ان کا مکان وزراء کے بنگلوں کی قطار میں تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل گولیوں کی آواز کے بعد خاموشی ہوئی ۔ کچھ سکون ہوا۔ حالات معلوم ہوئے تو آتشیں کھیل کی ساری دہشت کے کوہِ گراں کے پیچھے چوہا بھی نہ ملا ۔ پتہ چلا کہ پہلی گولی کسی نے چلائی تھی ۔ (ممکن ہے پہلی گولی مکتی باہنی کا کوئی شخص ایسے ہی چلا کر فرار ہو گیا ہو) پھر ایک بنگلے کی گارڈ نے سمجھا کہ اس بنگلے سے مکتی باہنی نے حملہ کر دیا ہے اور اس بنگلے کی گارڈ نے گولیوں کو اس بنگلے میں موجود مکتی باہنی کے ساتھ منسوب کیا ۔ پھر اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی ۔ بیچ میں حسن بھائی کا گھر بھی اس لپیٹ میں آ گیا ۔ ان کے بیڈ روم کی دیوار پر بے شمار گولیوں کے نشانات تھے ۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی جان تلف نہ ہوئی ۔ ورنہ ڈیڑھ گھنٹے میں جو ہزاروں گولیاں چلیں وہ کسی بھی گوشت پوست کے انسان کے پار ہو سکتی تھیں ۔

دراصل مکتی باہنی کا تصوّر ہمارے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا ۔ کہیں بھی کوئی خیالی ہیولا دیکھتے تو تڑ تڑ گولی چلا دیتے ۔ کوئی آدمی ہو تو مرے ۔ درخت کے تنے اور بجلی کے کھمبے تو گولی کی مار سے ختم ہونے سے رہے ۔ حالات دن بدن ہمارے اعصاب کو تھکا دے رہے تھے ۔ جب کہ مکتی باہنی کے نُپے تُلے تخریبی اقدامات میں

زیادہ اعتماد پیدا ہوتا جارہا تھا۔

عام شہریوں کے دلوں سے حفاظت کا تصوّر ختم ہوچکا تھا۔ وہ خود کو مکمل طور پر غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایک سے خوف زدہ تھے۔ یہاں تک کہ مسلح قوتوں کے افراد حفاظت کی غرض سے ہی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے خوف زدہ ہو کر ہنڈیاں چولہے پر پکتی چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

میں نے سنا تھا کہ جب مسلح قوتیں کہیں جارہی ہوتیں تو کوئی تخریب کار گاؤں سے ان پر گولی چلا کر بھاگ جاتا۔ تخریب کار کا وہاں بیٹھے رہنا تو بعید از قیاس ہے۔ وہ تو یقیناً وہاں سے فرار ہوجاتا تھا مگر پورا گاؤں مسلح قوت کے عتاب کی لپیٹ میں آجاتا اس طرح کے عتاب ملکی تباہی کی تعداد میں ہر لمحہ اضافہ کررہے تھے، لوگ سوچنے کہ جب مرنا ہی مقدر بن چکا ہے تو چوہے کی ذلیل موت مرنے سے بہتر یہی ہے کہ کسی مقصد کے لئے لڑ کر مرا جائے۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

رمضان المبارک کا مہینہ آیا۔ رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ — !مگر رحمتِ الٰہی ہم سے خفا رہی۔ مشرقی پاکستان میں صاحبانِ بصیرت کیسا کیسا تڑپے کہ صدر صاحب ایک مرتبہ وہاں کا دورہ کریں۔ مگر صدر صاحب کے مشیروں نے ان کے نشاط و طرب میں خلل انداز ہونے کی جرأت نہ کی۔ اصحابِ اقتدار ہزاروں میل دور بیٹھے محفوظ قلعوں میں رزم خیر و شر سنتے رہے۔ ہمارا دعویٰ بدستور قائم رہا کہ حالات پر مکمل طور پر قابو پا لیا ہے۔ ہم غیر ملکیوں کی تحریروں کو بہتان اور شرانگیزی پر مبنی قرار دیتے رہے مگر حالات خوفناک موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ میرے سامنے اس وقت اپنی ڈائری کا ۱۵ر نومبر کا ورق ہے۔ میں حرف بحرف اسے یہاں نقل کرتی ہوں۔

۱۵ر نومبر —— "بنگال میں عصبیت کا ناچ کچھ اس طرح ہو رہا ہے جو نہ کبھی سنا

نہ پڑھا۔ شیطانیت اور درندگی اپنی انتہائی پستیوں کو چھو رہی ہے۔ یعنی اس سے زیادہ عریاں اور وحشت ناک درندگی ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔

چند روز ہوئے اطلاع آئی کہ چٹاگانگ میں بہاریوں اور بنگالیوں کے درمیان مقامی فسادات ہو رہے ہیں۔ آئی جی پولیس چودھری صاحب اور ڈاکٹر حسن جائے وقوعہ پر معائنے کی غرض سے گئے۔ معلوم ہوا کہ بنگالیوں نے چھ بہاریوں کو قتل کر کے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بہاری مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے آبادی سے دور دو گڑھے کھودے اور وہاں قصاب مقرر کر دیئے۔ باقی پارٹی جہاں سے بھی کوئی بنگالی پکڑ سکتی پکڑ لاتی اور گڑھوں کے پاس قصاب بکرے کی طرح اسے ذبح کر دیتے اور اس گڑھے میں ڈال دیتے۔ بچے، بوڑھے اور جوانوں کی ایک سو چھیالیس لاشیں وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ خونی ڈرامہ تین چار روز سے جاری تھا اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ آخر ایک بنگالی جوان جسے ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے۔ کسی طرح بھاگ نکلا اور اس نے یہ حقیقت انتظامیہ کو بتائی۔

بنگالیوں کو موقع ملے تو وہ غیر بنگالیوں پر اس سے زیادہ وحشیانہ مظالم ڈھا رہے ہیں ــــ یعنی انسان قطعی انسان نہیں رہا۔ بلکہ اس علاقے میں بھوکے بھیڑیے بس رہے ہیں۔ کسی بنگالی اور بہاری کی تخصیص کے بغیر ہر انسان بھیڑیے کا کردار اپنائے ہوئے ہے۔ اس میں وہ محافظ بھی شامل ہیں جو اس علاقے کی حفاظت کرنے آئے تھے۔ یہاں کی ارزاں ترین جنس انسانی زندگی ہے۔ جس سے ہوس و حرص اور تعصب کا عفریت ہر گلی کوچے میں کھیل رہا ہے۔"

ان ہی دنوں امریکہ کے ایک رسالے میں خبر شائع ہوئی کہ "مسلح افراد نے ایک گاؤں "ڈمیرا" کو گھیرے میں لے کر تمام بارہ سے پینتیس سال کی عمر کی عورتوں کی عصمت ریزی کی اور تمام بارہ سال کے اوپر کے مردوں کو قتل کر دیا۔" کاش ہم

صاف ضمیر کے ساتھ یہ کہہ سکتے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اغیار نے لکھا: "ایک گاؤں پر ہی کیا منحصر ہے اکثر گاؤں میں یہ کہانی دہرائی جا رہی ہے۔" اے کاش کہ ہم کہہ سکتے کہ یہ دشمنوں کی شرانگیزی پر مبنی بالکل بے بنیاد خبریں ہیں۔

میں نے سنا کہ مسلح افراد میں بے یقینی، ناامیدی اور بے مقصدیت کا احساس بہت پھیل رہا تھا۔ ہمارے ایڈیشنل آئی جی انیس الرحمٰن عارف صاحب، ایک دلیر اور صاف گو شخص تھے۔ وہ دورے پر گئے تو سرحد پر کھدی ہوئی خندقوں کی طرف بھی چلے گئے۔ وہاں سپاہی بہت غیر مطمئن اور خفا تھے۔ جوٹ ماتھ اور زہریلے کیڑوں کے کاٹنے کے باعث بعض جلدی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ بے شمار مچھروں کی وجہ سے بخار بھی عام تھا۔ ان کے بقول انہیں ان سپاہیوں پر بہت ترس آیا۔ بلکہ انہیں افسوس تھا کہ وہ اپنے ہمراہ کچھ دوائیاں کیوں نہ لے کر گئے۔

دراصل دور افتادہ علاقوں میں یہ لوگ کھلے میدانوں اور دلدلوں میں بے یار و مددگار بیٹھے تھے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آنے والا کل ان کے لیے کیا مصیبت لائے گا — زندہ بھی ہوں گے یا بے گور و کفن لاشہ کہیں سڑ رہا ہو گا۔ چاروں طرف مقامی لوگ دشمن مکتی باہنی دشمن، باغی گوریلے دشمن — کس وقت کس کا شکار بنیں گے۔ کچھ معلوم نہیں — اور پھر وہ کس لئے اس طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان کا اصل مقصد کیا تھا۔؟؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ دور افتادہ دلدلوں اور زہریلے کیڑوں میں گھرے ہوئے وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں — صاحبانِ اقتدار کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ان کے متعلق سوچتے — حالات یہ تھے کہ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلح قوتوں کی اندرونی حالت اس بدمست و شکست خوردہ ہاتھی کی سی تھی جو ہر چیز کو پاؤں تلے روندنا چاہتا ہو۔ یہ لوگ اخلاق و کردار کی سب قدروں کو روند ڈالنا چاہتے تھے۔ جب ان کی زندگیوں کے ساتھ اس ظلم کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔ تو وہ

بھی اپنے امکان بھر انسانی زندگی و قدروں سے کھیلتے تھے — کوئی کسی کو جواب دہ نہ تھا۔ کوئی کسی سے باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ ورنہ ہمارے عزت و آن پر کٹ مرنے والے ایسے تو کبھی نہ تھے۔

لوٹ مار کا ایک بازار گرم تھا۔ شہروں میں دن دہاڑے لوٹ مار کے حادثات ہوتے تھے۔ اِن حادثات میں ایسے لوگ بھی پہچانے جاتے جن کی نشان دہی کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس لوٹ مار میں کس کا کتنا حصہ تھا یہ تو خدا ہی جانتا ہے مگر یہ ضرور ستا کر توتوں میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ملوا ئف الملوکی کا عالم تھا۔

○

شبِ تاریک بیمِ موج، گردابِ چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

مغربی پاکستان سے کچھ افسران دورے پر ڈھاکہ آئے ہوئے تھے ——— ہمایوں فیض رسُول صاحب نے سب کو رات کے کھانے پر سرکٹ ہاؤس میں ہی مدعو کر رکھا تھا۔ کھانے کے دوران کئی مرتبہ بم پھٹے۔ ہمارے تو تمام حواس ان ہولناک صداؤں کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر دورے پر آئے ہوئے افسران کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ انہوں نے اپنی مدّتِ قیام کو کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگوں کے لئے تو یہ معمول ہی تھا کہ ؏

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

وہ لوگ بہت حیرت سے ہمیں ہنستا بولتا دیکھ رہے تھے۔

ہم لوگ شام کو ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوتے تو تمام پردے ضرور گرا لیتے۔

دوستوں کا خیال تھا کہ پردہ بھی بندوق کی گولی کا زاویہ غلط کرنے میں بہت مددگار ہوتا ہے۔ اب سوچتی ہوں تو حفاظت کے ان خیالی سہاروں پر ہنسی آتی ہے۔

کمشنر ہاؤس میں بہت بڑے بڑے برسہا برس پرانے درخت تھے۔ ان درختوں پر ایک سانپ رہتا تھا۔ جس کا اصل نام نہ جانے کیا تھا۔ مگر ہم لوگ اسے "ہکو سانپ" کہا کرتے تھے۔ یہ سانپ ہم میں سے کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ یہ کسی درخت کی چوٹی پر رہتا تھا۔ مگر اس کی آواز بہت بلند اور گونجدار تھی۔ یہ آواز اس طرح نکالتا —" اوہکو ..... اوہکو ..... نہ جانے یہ شوشہ کس نے چھوڑا کہ اگر یہ سانپ بیک وقت تسلسل کے ساتھ سات دفعہ یہی آواز نکالے، تو فوراً ہی جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ باتیں کر رہے ہوتے۔ تاش کھیل رہے ہوتے، کھانا کھا رہے ہوتے یا کچھ بھی کر رہے ہوتے کہ یک دم آواز آتی —" اوہکو .... اوہکو .... اوہکو۔ لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گننے لگتے۔ ایک ..... دو .... تین .... چار اور — ہم اپنے ذہن میں جھٹ سے دعا مانگنے کے لئے تیار ہو جاتے۔" اے پروردگار! تو ہمیں کسی طرح سے عزت و آبرو کے ساتھ یہاں سے مغربی پاکستان بھیج دے —" مگر آواز بند ہو جاتی — ہم وہیں دانت پیس کر رہ جاتے — دیکھئے نا — اس کمبخت سانپ کا کیا جاتا تھا۔ سات دفعہ بول لیتا تو کم از کم ہم دعا ہی مانگ لیتے مگر وہ تو تین اور پانچ پر ہی خاموش ہو جاتا۔ اب سانپ کی آواز کے ساتھ اس خشوع اور خضوع کے متعلق سوچتی ہوں تو اپنی حماقت کا احساس ہونے لگتا ہے — مگر ان دنوں یہ احمقانہ دلائل بوجھل زندگی کی ناقابل برداشت حقیقتوں سے انحراف کے لئے کتنے ضروری تھے۔

اس شام ہم لوگ تاش کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے — اسی وقت انیس الرحمٰن

عارف صاحب اپنے دورے کے متعلق باتیں سنا کر ہٹے تھے۔ ابھی تک ماحول پر افسردہ تاثرات حاوی تھے کہ " دھا۔۔۔۔ا۔۔۔۔ڑ " اس زور سے ہوا کہ کلیجہ دہل گیا — تاش کے پتے میرے ہاتھ میں لرز گئے۔ " کیا ہوا —؟ " مخصوص آواز میرے منہ سے نکلی۔ عارف صاحب کے چہرے پر اطمینان بھرا سکون تھا — " او ہو — بھابی! بالائی منزل پر بچے نے زور سے دروازہ بند کیا ہوگا —" لیجئے بات ختم ہوئی۔ یعنی اب ہمارے لئے بم کے دھماکے اور دروازے کے بند ہونے کی آواز میں کوئی فرق نہ رہا — ہم نے ماحول کی ہولناکیوں کا مذاق اڑانا بھی سیکھ لیا تھا —

عید قریب آرہی تھی۔ خرید و فروخت میں گرماگرمی آچکی تھی۔ میں کچھ خریدنے بازار گئی تو وہاں کافی گہما گہمی تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ عید کی بدولت زندگی کے کچھ آثار تو نظر آئے۔ دکانوں کے سامنے کافی موٹریں بھی ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ ایک کار اور آکر عین بیچ میں کھڑی کر دی گئی۔ کار چلانے والا نکل کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ کسی نے دیکھا بھی نہیں کون تھا — دھا۔۔۔۔ا۔۔۔۔ڑ — اس موٹر کے ارد گرد کم و بیش تمام موٹروں کے پرخچے اڑ گئے۔ بھیڑ کی وجہ سے چند جانیں بھی تلف ہوئیں — دکانوں کو بھی نقصان پہنچا۔۔۔ اور خوف کی لہر نے عید کی خرید و فروخت کو سرد کر دیا — لوگ کہیں موٹر لے جاتے ہوئے بھی ڈرنے لگے کہ جہاں کھڑی کریں گے کیا معلوم مکتی باہنی والے وہیں کوئی موٹر بم سمیت لے آئیں۔ ان دنوں موٹریں بھی بہت چوری ہونے لگی تھیں۔ غالباً انہیں تخریبی کارروائیوں کے لئے۔

عید الفطر سے دو روز پہلے جمعرات کا دن تھا۔ صبح سحری کھانے کے لئے اٹھے تو ملازموں نے بتایا کہ ڈھاکہ شہر میں کرفیو کے نفاذ کا اعلان ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے دریافت کیا۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اسی وقت ڈپٹی کمشنر سے ٹیلیفون

پر رابطہ قائم کیا مگر انہیں بھی علم نہ تھا۔ بہر حال عام اعلان یہ ہو رہا تھا کہ جس کے پاس کوئی بندوق، پستول یا کوئی بھی اسلحہ ہو وہ اپنے گھر کے باہر رکھ دے۔ اسے کچھ نہ کہا جائے گا۔ ورنہ تلاشی لینے پر اگر کسی کے پاس اسلحہ نکلا تو وہ ہر قسم کی سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

اس دن دفتروں میں بھی چھٹی تھی۔ بچے نے سکول بھی نہیں جانا تھا۔ سب گھر میں موجود تھے۔ مگر پھر بھی ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ایسی خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک کے سکوت کو کسی وقت کوئی فوجی جیپ توڑتی ہوئی گزر جاتی —— اور بس —— پھر خاموشی —— سہمی سہمی —— خوفزدہ فضا —— وہی ہُو کا عالم ......

گیارہ بجے کے قریب ایک جیپ ہمارے گھر کے اندر داخل ہوئی —— جیسے سنسان جمود میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اور میرے شوہر بالائی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں آنے والے کو دعا دی جو زندگی کا پیغام اپنے ساتھ لایا تھا۔ ریڈ ٹیپ وردی میں ملبوس کوئی با وقار طریقے سے جیپ سے نکلا اور اندر ڈرائینگ روم میں داخل ہو گیا۔

ہم لوگ جلدی سے نیچے گئے۔ بریگیڈیر شفیع اپنی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ وہاں بیٹھے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک کپتان بھی تھے۔ ہم شفیع صاحب، اور ان کی بیگم کو کوئٹہ سے جانتے تھے۔ وہاں ان کی محنت، ایمانداری اور قابلیت کے تذکرے تھے —— یہ حال ہی میں مغربی پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ جو کپتان تھے وہ غالباً ایسٹ پاکستان سول فورس سے تعلق رکھتے تھے کیوں کہ اس فورس کی طاقت کے نشانات ان کے چہرے بشرے اور رویے سے ہویدا تھے۔

شفیع صاحب میں البتہ پرانے خلوص اور سادگی کی خصوصیات اسی طرح موجود تھیں۔ وہ بہت اداس نظر آرہے تھے۔ فرمانے لگے۔ "ارے بھئی کس چکر میں پھنس گئے۔"

"کیوں۔ کتنا اسلحہ وغیرہ ملا۔؟" میں نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے سوال کر دیا

"اسلحہ ؟؟"۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "ارے بھئی۔ بالکل ناممکن سی سچوایشن ہے۔ اب بتایئے کیا میں کسی کو پہچانتا ہوں ؟۔ جہاں بھی جاؤ وہاں سے پیس کمیٹی والے تین سو کی لسٹ پکڑا دیتے ہیں (یعنی اس لسٹ میں ہی مکتی باہنی والے ہیں) اس پر بھی اگر لائن لگا کر انہیں پہچاننے کو کہیں تو سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔"

بریگیڈیئر شفیع صاحب کی ایماندارانہ فطرت یہاں بھی کام کر گئی۔ ورنہ آج تک یہی سنتی تھی۔ "ہم سب کو درست کر دیں گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ ہم ایک ہفتے کے اندر حالات پر قابو پالیں گے وغیرہ وغیرہ۔" سچ پوچھئے تو یہ بالکل سچ تھا۔ سچوایشن بالکل ناممکن تھی۔ جگہ اجنبی۔ گلی کوچے اجنبی۔ زبان اجنبی ــــ مقامی لوگ نہ صرف اجنبی بلکہ معاندانہ رویّہ لئے ہوئے تھے۔ بندوق و توپ آگ تو برسا سکتی تھی مگر اس ناممکن سچوایشن کو سہل بنانے کا طلسم نہ رکھتی تھیں۔

ڈھاکہ شہر کو پانچ بریگیڈیئروں کے ماتحت تقسیم کیا گیا تھا۔ تاکہ باغی اجزاء سے پاک کیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا نتیجہ کیا رہا۔ مگر بریگیڈیئر شفیع صاحب کا تجربہ تو مایوس کن تھا۔ البتہ کوئی ڈیڑھ سو افراد گرفتار کئے گئے۔ مگر میرا مشاہدہ تو یہی ہے کہ ایسی گرفتاریوں میں باغی و تخریب کاروں کی تعداد یا تو صفر ہوتی تھی یا بہت کم ــــ عموماً معصوم لوگ ہی مارے جاتے تھے اور اس قسم کی گرفتاریاں

پر رابطہ قائم کیا مگر انہیں بھی علم نہ تھا۔ بہرحال عام اعلان یہ ہو رہا تھا کہ جس کے پاس کوئی بندوق، پستول یا کوئی بھی اسلحہ ہو وہ اپنے گھر کے باہر رکھ دے۔ اسے کچھ نہ کہا جائے گا۔ ورنہ تلاشی لینے پر اگر کسی کے پاس اسلحہ نکلا تو وہ ہر قسم کی سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

اس دن دفتروں میں بھی چھٹی تھی۔ بچے نے سکول بھی نہیں جانا تھا۔ سب گھر میں موجود تھے۔ مگر پھر بھی ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ایسی خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک کے سکوت کو کسی وقت کوئی فوجی جیپ توڑتی ہوئی گزر جاتی۔۔ اور بس۔۔ پھر خاموشی ــ سہمی سہمی ۔۔ خوفزدہ فضا ــ وہی ہُو کا عالم ......

گیارہ بجے کے قریب ایک جیپ ہمارے گھر کے اندر داخل ہوئی ــ جیسے سنسان جمود میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ۔ میں اور میرے شوہر بالائی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں آنے والے کو دعا دی جو زندگی کا پیغام اپنے ساتھ لایا تھا۔ ریڈ ٹیپ وردی میں ملبوس کوئی با وقار طریقے سے جیپ سے نکلا اور اندر ڈرائینگ روم میں داخل ہو گیا۔

ہم لوگ جلدی سے نیچے گئے ۔ بریگیڈیر شفیع اپنی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ وہاں بیٹھے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک کپتان بھی تھے۔ ہم شفیع صاحب، اور ان کی بیگم کو کوئٹہ سے جانتے تھے ۔ وہاں ان کی محنت، ایمانداری اور قابلیت کے تذکرے تھے ــ یہ حال ہی میں مغربی پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ جو کپتان تھے وہ غالباً ایسٹ پاکستان سول فورس سے تعلق رکھتے تھے کیوں کہ اس فورس کی طاقت کے نشانات ان کے چہرے بشرے اور رویے سے ہویدا تھے۔

شفیع صاحب میں البتہ پرانے خلوص اور سادگی کی خصوصیات اسی طرح موجود تھیں۔ وہ بہت اداس نظر آرہے تھے۔ فرمانے لگے۔" ارے بھئی کس چکر میں پھنس گئے۔"

"کیوں۔ کتنا اسلحہ وغیرہ ملا۔؟" میں نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے سوال کر دیا

"اسلحہ؟؟"۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔" ارے بھئی۔ بالکل ناممکن سی سیچوایشن ہے۔ اب بتائیے کیا میں کسی کو پہچانتا ہوں؟۔ جہاں بھی جاؤں وہاں سے پیس کمیٹی والے تین سو کی لسٹ پکڑا دیتے ہیں (یعنی اس لسٹ میں ہی مکتی باہنی والے ہیں) اس پر بھی اگر لائن لگا کر انہیں پہچاننے کو کہیں تو سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔"

بریگیڈیر شفیع صاحب کی ایماندارانہ فطرت یہاں بھی کام کر گئی۔ ورنہ آج تک یہی سنتی تھی۔" ہم سب کو درست کر دیں گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ ہم ایک ہفتے کے اندر حالات پر قابو پالیں گے وغیرہ وغیرہ۔" سچ پوچھئے تو یہ بالکل صحیح تھا۔ سیچوایشن بالکل ناممکن تھی۔ جگہ اجنبی۔ گلی کوچے اجنبی۔ زبان اجنبی۔ مقامی لوگ نہ صرف اجنبی بلکہ معاندانہ رویہ لئے ہوئے تھے۔ بندوق و توپ آگ تو برسا سکتی تھی مگر اس ناممکن سیچوایشن کو سہل بنانے کا طلسم نہ رکھتی تھیں۔

ڈھاکہ شہر کو پانچ بریگیڈیروں کے ماتحت تقسیم کیا گیا تھا۔ تاکہ باغی اجزاء سے پاک کیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا نتیجہ کیا رہا۔ مگر بریگیڈیر شفیع صاحب کا تجربہ تو مایوس کن تھا۔ البتہ کوئی ڈیڑھ سو افراد گرفتار کئے گئے۔ مگر میرا مشاہدہ تو یہی ہے کہ ایسی گرفتاریوں میں باغی و تخریب کاروں کی تعداد یا تو صفر ہوتی تھی یا بہت کم۔ عموماً معصوم لوگ ہی مارے جاتے تھے اور اس قسم کی گرفتاریاں

مکتی باہنی کی تعداد بڑھا رہی تھی۔

۱۹ رنومبر کو عید الفطر تھی ۔ مکتی باہنی والوں نے افواہ اڑائی تھی کہ عید پر تخریبی کارروائیاں عروج پر ہوں گی ۔ گارڈ کے جوانوں نے اپنے کوارٹروں کے پاس ہی اینٹوں سے چبوترہ سا بنا کر مسجد کی شکل دے دی ہوئی تھی ۔ پورے رمضان المبارک میں نماز وغیرہ وہ اسی مسجد میں ادا کرتے رہے تھے ــــ عید کی نماز بھی وہیں ادا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ پولیس لائن سے ایک مولوی صاحب بلوائے گئے اور چبوترے پر نمازِ عید ادا کرنے سب جمع ہو گئے ــــ مولوی صاحب بنگالی تھے ' انہوں نے خطبہ دیا اور آخر میں پاکستان کے لیے کوئی دُعا نہ کی ۔ جب جوانوں نے بہت اصرار کیا کہ پاکستان کے لیے ضرور دعا کیجیے تو محض یہ کہا کہ خدا سب کچھ ٹھیک کر دے ۔ اور بس ــــ یعنی اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اتنے مغربی پاکستانیوں میں بیٹھ کر کثیر رقم وصول کر کے بھی ایک بنگالی تکلفاً بھی پاکستان کی خیرخواہی کے کلمات منہ سے نکالنے کو تیار نہ تھا ۔

لوگ عید ملنے آنے لگے ۔ بنگالی دوست بھی آئے ۔ ہم سب مثلِ سابق ملے مگر ایک نہ دکھائی دینے والی دیوار بیچ میں حائل ہو چکی تھی ۔ جسے ہم نے بغیر دیکھے محسوس کر لیا ۔ بغیر کچھ کہے ــــ ہمارے جتنے فوجی دوست آئے وہ پوری وردی میں آئے ۔ ان سب نے نمازِ عید وردی میں پڑھی تھی ۔ ایک کرنل صاحب کہہ رہے تھے کہ " چوبیس سال کی ملازمت میں یہ پہلا موقع ہے کہ عید کی نماز وردی میں پڑھی ہے ۔ " صبح تا شام فوج شہر میں گشت لگاتی رہی اور شام کو خدا کا شکر ادا کیا کہ عید بغیر کسی بڑے تخریبی ہنگامے کے ختم ہو گئی ۔ (اِکّا دکّا بم پھٹنا تو روز کا معمول بن چکا تھا ۔ اسے ہم تخریبی ہنگامے میں شمار ہی نہیں کرتے تھے)

بیس نومبر کی شام کو ہم سب حبیبہ بھابی کے ہاں جمع تھے ۔ حالات میں بظاہر

کوئی نیاپن نہ تھا ۔ وہی باتیں تھیں ۔ وہی تبصرے اور وہی ہکوّ سانپ کی آواز پر دعائیں مانگنے کی تیاریاں . . . . .

جب ہم واپس آئے تو رات خاصی بھیگ چکی تھی ۔ ابھی بمشکل آنکھ لگی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ میرے شوہر نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور اچھل کر اُٹھ بیٹھے ـــــ ٹینگائیل کے ڈپٹی کمشنر کا ٹیلیفون تھا کہ " مرزا پور ہمارے ہاتھ سے بالکل نکل چکا ہے اور فلاں فلاں تھانے بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے ۔" اُسی وقت میرے شوہر نے فوج کے اربابِ اختیار سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا تو انہوں نے اطلاع دی کہ " یہ چند تھانے تو بہت معمولی چیز ہیں ۔ بھارت کے ایک پورے بریگیڈ نے ہماری ایک سرحد پر حملہ کر دیا ہے ۔ گو ابھی اعلانِ جنگ نہیں ہوا ۔ مگر اسے جنگ ہی سمجھو ۔"

میرے شوہر نے اسی وقت فیصلہ صادر کر دیا کہ مجھے فوراً واپس مغربی پاکستان چلے جانا چاہیئے ـــــ طے یہ پایا کہ دوسرے روز شام کی فلائیٹ سے میں ڈھاکہ چھوڑ دوں ۔

۲۱ر نومبر کی صبح تمام تر افسردگی اور یاسیت کے ساتھ طلوع ہوئی ۔ بوگرا والے ڈاکٹر چودھری اب ڈھاکہ میں ڈائرکٹر ہیلتھ تھے ۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ ملنے آئے ڈاکٹر چودھری کے بال سفید ہو چکے تھے ۔ مسز چودھری کے چہرے پر عمر و سال کے نقوش نمایاں تھے ۔ یہ لوگ ہمارے بہت اچھے دوست ہوا کرتے تھے ۔ اس روز بھی اچھی طرح ہی ملنے آئے تھے ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اختیار ہمارے لوگوں کے پاس تھا ۔ اس لمحہ محفوظ ہم لوگ تھے ۔ وہ تو چشمِ اقتدار کے لئے مشتبہ لوگ تھے نا ـــــ مگر میری پریشان نظروں نے مسز چودھری ، جو چھوٹی سی ، بالکل گھریلو خاتون تھی کے اندر عجیب قسم کا اعتماد دیکھا ۔ ایسا اعتماد جو کسی یقین و اعتقادِ مقدس

کے سہارے کھڑا ہو۔ ایسا اعتماد جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا ۔۔۔۔

ان کے جاتے ہی ہم لوگ ذہنی و اخلاقی توانائی کی پیاس میں جنرل جمشید صاحب کے ہاں چل دیئے ۔ میں بیگم جمشید کے پاس بیٹھی رہی جب کہ میرے شوہر جنرل صاحب کے پاس ان کے دفتر میں چلے گئے ۔

بیگم جمشید کے حوصلے اسی طرح بلند تھے ۔ ان کی ہمت دیکھ کر مجھے اپنی پریشانی محض بزدلی پر مبنی غیر حقیقی شے لگی ۔ وہ نہ صرف خود ہنس مکھ ، رجائیت پسند اور باحوصلہ خاتون تھیں ، بلکہ انہیں اپنے ملاقاتیوں میں بھی ہمت و حوصلہ پیدا کر دینے کا کمال آتا تھا ۔

جب میرے شوہر واپس آئے تو میں پُرسکون ماحول میں ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھی ۔ معلوم ہوا کہ گذشتہ شب جو بھارت کی طرف سے حملہ ہوا تھا اسے پسپا کر دیا گیا ہے ۔ اور جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ ڈھاکہ کے حالات ایک ہفتہ میں مکمل طور پر نارمل کر دیئے جائیں گے ۔ انہوں نے مجھے واپس بھیجنے کو گھبراہٹ اور پریشانی پر مبنی عمل قرار دیا ۔ اور بکمال لطف و کرم یہ وعدہ کیا کہ اگر حالات واقعی اتنے خراب ہو گئے ، جن کی امید بالکل نہیں ، تو مسز رضا کو مغربی پاکستان بحفاظت بھجوانا میری ذمہ داری رہی ۔"

میں تو پہلے ہی بیگم جمشید سے گفتگو کے دوران مغربی پاکستان نہ جانے کا فیصلہ کر چکی تھی ۔ جنرل صاحب کی اس نوازش نے میرے حوصلے اور بلند کر دیئے ۔ اور میں اپنے فیصلے پر اڑ گئی ۔ "بھئی جب اس علاقے کے محافظ جو ہر حقیقت سے باخبر ہیں ، وہ یہ کہہ رہے ہیں تو آپ خواہ مخواہ ہی گھبرائے جا رہے ہیں ۔" میں نے اپنے شوہر کو اپنا فیصلہ سنا دیا ۔

(جنرل صاحب کی مشفقانہ پیش کش بغیر کسی قسم کی منافقت کے محض مہربانی

اور سچائی پر مبنی تھی۔ اس لئے کہ بعد میں جب حالات ۷ا دسمبر کے المیے تک پہنچے اور جنرل جمشید صاحب خواتین کو ہیلی کاپٹر پر بھجوا رہے تھے تو وہ اس میں میری نشست رکھوانا نہ بھولے تھے اور مضطربانہ طور پر میرے شوہر کو فوراً مجھے بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔)

اگلے روز شام کو مسعود مفتی آئے۔ یہ ایسے شخص ہیں جن کی دوستی پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ جلدی میں تھے بولے۔ "بھابی ایک بات کہنے آیا ہوں ــــ"

"فرمائیے ــــ" مجھے ان کی دانش مندی کا یقین تھا۔

"آپ یہاں سے مغربی پاکستان چلی جائیے ــ"

"اوہ ــــ" مجھے ان کی دور اندیشی پر شک ہونے لگا۔ "بھائی بات یہ ہے کہ آپ لوگ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔" میں نے جنرل جمشید والی بات انہیں بتائی اور کہا۔ "میں یہیں رہوں گی ــ"

"آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے ــــ" مسعود مفتی نے آخری مرتبہ پوچھا۔

"بلی ہاں ..... بالکل سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اپنا حتمی جواب سنا دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ــ" کہہ کر وہ جس روا روی آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ اور میں سوچنے لگی کہ یہی بنیادی فرق ہے ایک فوجی اور شہری کے خیالات کے زاویوں میں! ایک جنرل صاحب ہیں کہ ہمت و حوصلہ کی روشنی کا مینار ــــ ان سے بات کر کے اپنے اندر قوت سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ــــ اور ایک یہ شہری ہیں، اندیشوں اور فکروں کا انبار دماغ میں سمیٹے ہوئے۔ بس ڈرے جا رہے ہیں، بے وجہ ہی ــ!!

میرا فیصلہ تو قبول کر لیا گیا تھا۔ مگر میرے شوہر کچھ خاموش رہنے لگے تھے۔

۲۵ نومبر کی صبح کو خاموشی کے آتش فشاں سے ایک لاوا پھوٹ نکلا — اور انہوں نے اپنا آخری فیصلہ صادر کر دیا — "تم کل جا رہی ہو۔ میری بزدلی پر مبنی سہی مگر یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آ رہی ...." میرے شوہر کی نیند مشہور ہے۔ اِدھر تکیے پر سر رکھا اور اُدھر خراٹے شروع — میں ہکا بکا انہیں دیکھنے لگی۔ "جو کچھ ہونا ہے پندرہ بیس روز میں ہو جائے گا۔ یہ نوشتۂ دیوار مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔ اگر میدان ہمارے ہاتھ رہا تو بیس پچیس روز کے بعد تم چلی آنا۔ مگر کل تمہیں جانا ہی ہے۔ یہ شوہر کی بے جا اور ناجائز ضد ہی سہی لیکن تمہیں ماننی پڑے گی۔" میں خاموش رہی۔ میرے لئے کہنے کو رہا ہی کیا تھا۔

میرے شوہر دفتر سے واپس آئے تو مصمّم ارادے کی سختی ان کے چہرے پر عیاں تھی۔ سنجیدگی سے میرے ہاتھ میں جہاز کے ٹکٹ دیئے اور کہا۔ "اسلم بھائی کا کراچی سے فون آیا تھا تمہیں فوراً واپس آنے کا کہہ رہے تھے —" بریگیڈیر اسلم ہمارے بہت عزیز دوست اور بہی خواہ تھے۔ "اسلم بھائی کو کراچی میں بیٹھے ہوئے یہاں کے حالات کا کیا پتہ؟" میں نے دل میں سوچا — "یہ سب لوگ نہ جانے کیوں حماقت کی باتیں کر رہے ہیں۔ بھئی جب موقع پر موجود ذمہ دار حضرات یقین دلا رہے ہیں کہ کچھ نہیں ہوگا، تو یہ سب خواہ مخواہ ہی افلاطون بن رہے ہیں۔"

میرا منہ غصّے کے مارے پھولا ہوا تھا۔ مگر میرے شوہر ہدایات دینے پر مُصر تھے۔ نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب میرے شوہر نے تنگ آکر کہا تھا۔ "دیکھو۔ میری باتیں غور سے سنو، مجھے یوں لگتا ہے کہ مجھے جنگی قیدی بنا لیا جائیگا۔"

"اللہ نہ کرے"— میں نے غصّے کے باوجود جھٹ سے ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

مجھے اپنے شوہر کے فیصلے کی صحت پر اتنا شک اور جنرل صاحب کے

"کچھ نہیں ہوگا" پر اس قدر یقین تھا کہ ہوائی جہاز پر چڑھتے ہوئے بھی میں نے منہ پھلاتے رکھا — "حد ہوگئی بزدلی کی بھی — کچھ بھی نہیں ہوگا — بس یونہی گھبرائے جا رہے ہیں۔

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا!

دسمبر میں ملک کے دونوں بازوؤں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ میں ہری پور میں اپنی بڑی بہن کے پاس یہ دن گزار رہی تھی۔ پنڈی میں ہمارے ایک مہربان جو صدر صاحب کے مصاحبین میں سے تھے اور ہمارے ایک عزیز دوست کے بڑے بھائی تھے کی زبانی میرے شوہر کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ ۱۳ر دسمبر کو میں خود راولپنڈی گئی تاکہ ٹیلی فون کر کے کچھ تسلی ہو۔ اس روز کی ڈائری کا ورق خاصا طویل ہے اور اسے میں حرف بہ حرف یہاں میں نقل کرنا چاہتی ہوں۔

۱۳ر دسمبر۔ رات دس بجے ——————

"آج میں راولپنڈی سوا دو بجے دوپہر کو پہنچی۔ مسز...... نے اُسی وقت ڈھاکہ کے لئے فون کال بُک کروا دی۔ معلوم ہوا کہ میرے شوہر اور سول

کے باقی تمام اعلیٰ افسران گورنر ہاؤس میں منتقل ہو چکے ہیں۔ کمشنر کا فون بھی گورنر ہاؤس میں جا چکا تھا۔

فون ملنے میں ابھی کچھ وقت تھا کہ ہمارے مہربان تشریف لے آئے۔ یہ اسی وقت صدر صاحب کی میٹنگ سے آرہے تھے۔ فرمانے لگے۔" بھئی آج تو حالات کی بہت چمکدار تصویر سامنے آگئی ہے ــــ امریکہ کا جنگی بحری بیڑہ تائیوان سے آکر خلیج بنگال میں داخل ہو گیا ہے۔ بس رات تک چٹاگانگ پہنچ جائے گا۔ اور بس۔ اب سب کچھ ٹھیک سمجھو۔" وہ خاصے ایکسائیٹڈ تھے۔ "ارے بھئی یہ صرف آپ سب کی دعاؤں کا اثر ہے۔ ورنہ ہماری سیاست وغیرہ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ بس دیکھئے، امریکہ خود ہی مدد کو آگیا ــــ" (کسی دوست کے گھر میں بھی بلا اجازت گھس جانا قانون کی لُغت میں "مجرمانہ مداخلت" کہلاتا ہے۔ دوسرے ملک کا بن بلائے مدد کے لئے پہنچنا نہ جانے کن قانونی اصولوں پر مبنی تصوّر کیا جا رہا تھا۔)

میرا ذہن تو اس وقت صرف اپنے شوہر کی خیریت جاننے کے لئے بے چین تھا لہٰذا میں نے عرض کی ــــ" بھائی! یہ تو آپ قومی سطح کی بات کر رہے ہیں، اور میں اس وقت صرف اپنے شوہر کی خیریت جاننا چاہ رہی ہوں۔"

فرمایا ــــ" ارے بھئی ایک شخص یا سب ہی افراد کی ملک کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ بس ملک بچ جائے۔"

بہت ضبط سے عرض کی ــــ" وہ تو آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر پھر بھی جو لوگ وہاں پھنسے ہوئے ہیں ان کا کیا ہوگا ــــ؟"

وہ ان خطوط پر سوچنے کو تیار نہ تھے۔ مگر پھر انہیں کسی طرح میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ فرمایا ــــ" بھئی ان سب کو تو کل تک ہم "رائیٹ آف" کر چکے تھے

(کس قدر آسان بات تھی) مگر آج تو بحری بیڑہ آگیا نا امریکہ کا۔ بس اب امید بندھ گئی ہے — کچھ نہ پوچھو — اب تو ہم سب بہت خوش ہیں۔ آج تو خوشی کے مارے مجھ سے کام بھی نہیں ہوا۔

ڈرتے ڈرتے عرض کی تھی۔ اللہ کرے کچھ ہو جائے۔ بہت جانیں تلف ہو رہی ہیں۔"

وہ دوبارہ جوش میں آگئے — "لیجئے صاحب — جانوں کی ملک کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ آج ایم۔ایم۔ احمد نے بھی میٹنگ میں یہی کہا تھا اور صدر صاحب نے غصے میں جواب دیا تھا کہ —— "کیا جنگ میں ایک دوسرے پر پھول پھینکے جاتے ہیں؟"

سبحان اللہ — جناب! کیا نظریات ہیں اور کیا حب الوطنی ہے —— حضرات! پھول تو آپ نے ہمارے عوام کے لئے کبھی نہ پھینکے تھے۔ آپ صاحبان کا بس چلے تو آپ تو قدرت کے عطا کردہ پھولوں کو بھی حکم دیدیں کہ وہ آپ کے دولت کدوں کے علاوہ کہیں اور نہ کھلیں۔

ملک اور وطن کے متعلق بڑھ چڑھ کر بات کرنے والے۔۔۔۔ صاحب! کاش آپ لوگوں کا احساس اس قدر مردہ نہ ہو گیا ہوتا —! اور آپ کبھی یہ سوچتے کہ ملک افراد سے ہوتا ہے۔ افراد کی اہمیت نہ سمجھنے والے ملک و وطن کی بنیادی تعریف نہ سمجھ سکیں گے — آپ جو قربانیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ تو کاش آپ صاحبان نے اپنے آرام کی صرف اتنی ہی قربانی دی ہوتی کہ ہمارے صدر محترم کو ساتھ لے کر ایک چکر مشرقی پاکستان کا لگا لیتے — یا مغربی پاکستان کی سرحدوں کا ہی دورہ کر لیتے جہاں قوم کے سجیلے جوان کٹ رہے ہیں۔

مگر جن افراد کی قربانیوں سے ملک بنتے ہیں اور جس کا آپ بار بار ذکر کر

رہے ہیں ۔ آپ حضرات تو ان افراد سے ماورا ہیں نا ___ قربانی کے بکرے تو ذبح ہونے کے لیئے ہی ہوتے ہیں ۔ آپ اپنا لطفِ نشاط ان کا حشر سوچ کر کیوں خراب کریں ۔ مشرقی پاکستان میں فوج مکمل طور پر گھِر چکی ہے ۔ تو مرنے دیجیئے اسے ___ اُسے آپ نے "رائیٹ آف" کر دیا تھا ۔ اچھا ہی کیا ___ مغربی پاکستان میں آپ کے بقول اُدھر سے ٹینکوں کے ساتھ بریگیڈ ہوتا ہے ۔ تو اپنے جوان ایک کمپنی کے تناسب سے بندوقیں لے کر ان کے مقابل کٹنے کے لیے آ جاتے ہیں ۔ مگر خیر ___ اس سے کیا ہوتا ہے ۔ ہمارے جوان شہید ہوں گے ۔ جنت میں جائیں گے ۔ آپ اپنی جنّت کو ، جو آپ کو میسّر ہے کیوں کھٹائی میں ڈالیں

ع شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

اور ان جوانوں کو آپ کی بے مقصد سیاست ، جو صرف چند افراد کو عیاشی مہیا کرنے تک محدود رہے ، کے بھینٹ چڑھ ہی جانا چاہیئے ..... حبُ الوطنی کا جذبہ دل میں لیئے .... شہادت کا ذوق سینے میں چھپائے ___ اس لیے کہ انہیں تو جوان ہی اسی لیئے کیا گیا تھا نا ! ___ کہ یہ وطن و ملّت پر شہید ہو جائیں ۔

کوئی پونے چار بجے کے قریب ڈھاکہ کا فون ملا ۔ میری اپنے شوہر سے بات ہوئی ۔ وہ حسبِ عادت رجائیت پسندی کا مظاہرہ کر رہے تھے ۔ شاید اس لئے کہ میں پریشان نہ ہو جاؤں ۔ حالانکہ حسن بھائی سے میری بات ہوئی ۔ وہ بھی تو میرے شوہر کے ساتھ ہی گورنمنٹ ہاؤس ڈھاکہ میں تھے ۔ وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے کہ "بھارت کی فوجیں دس میل پر کھڑی ہیں اور اب ہمارے بچاؤ کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ بس آپ دُعا کریں ___"

"یا بحر و بر کے مالک ! تُو اپنے حبیبؐ کے صدقے ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا ___" میرے دل کی گہرائیوں سے دُعا نکلی ۔

۱۴ دسمبر ـــــــ

آج رات بی بی سی نے بتایا کہ ڈھاکہ کے گورنمنٹ ہاؤس پر بے تحاشا بمباری ہو رہی ہے اور گورنر ڈاکٹر مالک اور ان کی کابینہ نے استعفےٰ دے دیا ہے ۔ (بعد میں حالات معلوم ہوئے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر مالک نے اس وقت صدرِ محترم سے بات کرنے کی مضطربانہ کوشش کی تھی ۔ مگر ہر سعی کے باوجود وہ صدر صاحب سے بالواسطہ ٹیلیفون پر بات نہ کر سکے تو انتہائی مایوسی کے عالم میں انہوں نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا کہ اگر ان حالات میں بھی میرے لئے صدر صاحب سے بالواسطہ رابطہ قائم کرنا ممکن نہیں تاکہ میں انہیں صورت حال سے آگاہ کر سکوں تو میرا موجودہ عہدے پر قائم رہنا بے کار ہے لہٰذا میں استعفےٰ دیتا ہوں) اور سولہ حکام کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں بحفاظت لیجایا گیا ہے ۔ یہ علاقہ ریڈ کراس کے زیر سایہ غیر جانبدار علاقہ قرار دیا گیا ہے ۔ ان حکام میں ایم ۔اے ۔کے چودھری آئی جی پولیس بھی شامل ہیں ۔

دن بھر انتہائی پریشانی میں گزرا ۔ " میرے آقا تو ہی قادر مطلق ہے ۔ تو ڈبے بڑے کو تیرا آتا ہے تو ہی ان سب کا حافظ و ناصر ہے ۔ اپنے حبیبؐ پاک کے صدقے انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھنا ۔" دن بھر میں دعائیں مانگتی رہی ۔

۱۶ دسمبر ـــــــ

آج صبح بی بی سی نے بتایا کہ جنرل نیازی اور جنرل مانک شا کے درمیان جنگ بندی کی شرائط طے ہو رہی ہیں ۔ جنرل نیازی کی شرط یہ ہے کہ ان کی فوج کے ہتھیار نہ لئے جائیں اور انہیں کسی ایسے علاقے میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ مغربی پاکستان جا سکیں ۔ مگر مسز اندرا گاندھی اس شرط کو کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہیں .... وہ کہتی ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی

بڑی فوج کو بھارت کے خلاف ایک اور سیکٹر میں لڑنے کے لئے ہتھیاروں سے لیس بھیج دیا جائے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جنگ بندی پاکستان کی طرف سے غیر مشروط ہو۔ جنرل نیازی اور بقیہ موجود فوج کو جنگی قیدی رکھا جائے گا۔ مگر ان کے ساتھ جنیوا کے معاہدہ کے مطابق سلوک ہو گا۔ جنرل نیازی نے مزید سوچنے کے لئے چھ گھنٹے کی مہلت مانگی تھی جو دے دی گئی۔

۱۷ر دسمبر ______

بی بی سی کی نشریات میں بتایا گیا کہ جنرل نیازی نے غیر مشروط جنگ بندی قبول کرلی۔ اور ساڑھے چار بجے ڈھاکہ اسٹیڈیم میں "سرنڈر" کی تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں جنرل نیازی اور بھارت کی مشرقی کمان کے لیفٹیننٹ جنرل اروڑا نے جنگ بندی کی دستاویز پر دستخط کئے۔

اس کے بعد جنرل نیازی نے اپنی پستول گولیوں سے خالی کی اور وردی پر سے بلے وغیرہ اتار کر جنرل اروڑا کے حوالے کئے ______

یہ سن کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ اپنی فوج کے افراد اپنی پوری آن بان کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگئے ..... آہ .... آہ ..... آج ڈھاکہ میں بھارت کی فوجیں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوگئیں۔ آہ ..... ایک بھارتی لیفٹیننٹ کرنل سے جب بی بی سی کے نمائندے نے پاکستان کی شکست کی وجوہات پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا تو وہ فاتحانہ شان سے بولا:

" اتنا اسلحہ جو ہمیں پاکستانیوں سے ملا
ہے اس کے ہوتے ہوئے سرینڈر
کرنا باعثِ تعجب تو ہے ۔ حقیقت

یہ ہے کہ پاکستان کی فوج کے پاس
کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ ایک بے مقصد
جنگ لڑ رہے تھے ۔"

جنرل اروڑا سے پوچھا گیا تو اس نے کہا:

"ایک تو پاکستانی فوج تمام علاقے میں پھیل
گئی تھی لہٰذا اس کے لئے کسی ایک جگہ مرتکز ہو کر لڑنا
ممکن نہ تھا۔ دوسرے ان کے تحت الشعور
میں ہمیشہ یہ تھا کہ وہ اپنے وطن سے دور
ایک اجنبی سرزمین میں لڑ رہے ہیں ۔"

بتایا گیا کہ جب بھارتی فوج ڈھاکہ میں فاتحانہ انداز میں داخل ہو رہی تھی تو آگے آگے ایک بھارتی بریگیڈیئر جیپ پر فاتحانہ شان سے جا رہے تھے۔ پاکستانی فوجیوں کو اڑتالیس گھنٹے تک بندوقیں اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی گئی تھی تاکہ مقامی لوگ اور مکتی باہنی کے افراد ان کو انتقام کی وجہ سے کوئی زک نہ پہنچائیں۔

(جواب نہیں سیاست کا۔ کس طرح دنیا کے سامنے ثابت کر دیا کہ مقامی لوگ پاکستانی فوج کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔)

بتایا گیا کہ جب بھارتی فوج فاتحانہ انداز سے گزر رہی تھی تو مقامی لوگ خوشی و مسرت سے سڑکوں پر ناچ اور گا کر خیر مقدم کر رہے تھے۔ جب کہ چند پاکستانی فوج کے جوان جن سے ابھی اسلحہ نہیں لیا گیا تھا بھونچکاں کھڑے تھے ۔ بھارتی بریگیڈیئر نے انہیں بلا کر آرام سے کہا۔ "جوانو! تم یہاں مت کھڑے رہو بلکہ اپنی بارکوں میں چلے جاؤ کہ تم وہاں زیادہ محفوظ رہو گے۔"

آہ ..... آہ ..... یہ سب میں سن رہی ہوں۔ اور دل سے خون

قطرہ قطرہ بن کر رس رہا ہے — آہ — آج ہمارا ایک بازو - ہمارا اپنا وطن بے مقصد سیاست اور عیاشی و ہوس کی نذر ہو گیا — آہ — میرے خدا — قائداعظم آیئے کہ اس ملک کو کس بیدردی سے اپنے ہی رہنماؤں کی بے مقصد سیاست نے کاٹ دیا ہے۔

اے کاش ! یہ آمر کبھی تو جا کر وہاں کے حالات دیکھتے۔ مگر انہیں اپنے جشنوں سے فرصت ہی نہ ملی - اور آج ہمارا ملک کٹ کر تڑپ رہا ہے۔

نمیگر دید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم

○

کتابت : صدیق منظر تلمیذ یوسف نگینہ